نیرنگِ خیال

حصّۂ اوّل

نولکشور پریس لمیٹڈ لاہور

فہرستِ مطالب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تماشاگاہِ عالم میں جو اہلِ نظر ایک نگاہ سے میدانِ ماضی اور ایک سے حال و استقبال کی سیر دیکھ رہے ہیں انہیں صاف نظر آتا ہے کہ ملک ہمارا عنقریب ایک آفرینش جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا چاہتا ہے۔ نئے نئے علوم ہیں۔ نئے نئے فنون ہیں۔ سب کے حال نئے ہیں۔ دلوں کے خیال نئے ہیں۔ عمارتیں نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں۔ رستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں۔ اس طلسمات کو دیکھ کر عقل رسا حیران ہے۔ مگر اسی عالمِ حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سولزیشن (تہذیب) کی سواریِ شاہانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ویرانہ کو جھاڑ بہار رہا ہے اور جس حال میں ہے اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے +

جو نقشے کھنچ رہے ہیں اور جو بنیادیں پڑ رہی ہیں اگرچہ ابھی تک کچھ اصل نہیں رکھتے لیکن جو نظر باز تجربہ کی عینک سے دیکھ رہے ہیں وہ سمجھ رہے ہیں کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ بنیادیں آسمان سے باتیں کرنے لگینگی۔ اور آبادیاں روئے زمین پر چھا جائینگی۔ وہ بنیادیں کیا ہیں؟ اور نقشوں سے کیا مراد ہے؟ ہاں نقشے کتبِ علوم و فنون ہیں۔ اور بنیادیں تصانیفِ بوقلموں کہ جو کچھ سود و بہبود ہماری قسمت میں ہے انہی پیمانوں اور اندازوں پر ہمیں ملیگا +

اب تک اس ملک نے اپنی غریب حالت کے بموجب بہت سا سرمایۂ تصنیف کا بہم پہنچایا۔ اور آج سے ۵۰ - ۶۰ برس پیچھے ہٹ کر دیکھیں تو ہمارے عام مطالب و اغراض بلکہ بات بات میں زمین آسمان کا فرق آگیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ

علوم و فنون انگریزی جس طرح ہمارے لباس - مکانات - حالات - خیالات اور معلومات سابقہ میں ترمیم کر رہے ہیں - اسی طرح اُس کی انشا پردازی بھی ہماری انشا میں اصلاح دیتی جاتی ہے - لیکن علم زبان میں اس فرق کا امتیاز کرنا ہر شخص کا کام نہیں - جنہیں اس کا مذاق ہے - وہی سمجھتے ہیں - ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں جو کچھ اُردو کا رنگ نکلا تھا - سبزۂ خود رو کی طرح نکلا تھا - خاص و عام کے دلوں کی اُمنگ تھی - جدھر جھک گئے اُدھر جھک گئے - خاص شخص کی یا خاص اُصول کی کوشش نہیں ہوئی اور اب تک یہ حال ہے کہ تاریخ - فروعِ ریاضی وغیرہ اکثر علوم کی کتابیں ترجمہ اور تصنیف ہوئیں - مگر فنِ انشا کی طرف کسی نے خیال نہیں کیا - زبان اُردو ایک لاوارث بچّہ تھا کہ اُردوے شاہجہانی میں پھرتا ہوا ملا - کسی کو اس غریب کے حال کی پروا نہ ہوئی - اتفاقاً شعرا نے اُٹھا لیا - اور محبت سے پالنا شروع کیا - اُس نے اُنہی کے کھانے سے خوراک پائی - اُنہی کے لباس سے پوشاک پہنی - اُنہی سے تعلیم کا سرمایہ لیتا رہا - اسی واسطے انہی کی زبان سے بولنا سیکھا - اُنہی کے قدموں پر چلنا سیکھا - انہی کے خیالات اس کے دل و دماغ میں سمائے - حالت اس کی یہ رہی کہ علما تو درکنار - ادنے ادنے آدمی اُردو میں لکھنا ہتک سمجھتے تھے - جب ۱۰۳۵ھ؁ میں اُس نے دفاتر سرکاری میں دخل پایا ساتھ ہی اخباروں پر قبضہ ہو گیا - تب لوگوں کی نظروں میں عزت و وقار ہوا - اور رفتہ رفتہ کل ہندوستان پر قابض ہو گیا +

غرض کہ زبان اُردو کے پاس جو کچھ اصل سرمایہ ہے وہ شعراے ہند کی کمائی ہے جنہوں نے فارسی کی بدولت اپنی دُکان سجائی ہے - یہ مفلس زبان علمی الفاظ میں تو اس لئے تہیدست رہی کہ یہ ملک کی علمی زبان نہ تھی - افسوس یہ ہے کہ عام مطالب کے ادا کرنے میں بھی مفلس ہے - چنانچہ اگر تاریخ یا کسی قسم کی سرگذشت اس زبان میں لکھیں تو جو اصلی حالت یا اپنے دل کا ارمان ہے وہ نہیں نکل سکتا - اسی واسطے اس کا اثر بھی جیسا کہ جی چاہتا ہے پڑھنے والے کے دل تک نہیں پہنچتا - بات یہ

ہے۔ کہ اس کی سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے۔ جو کچھ ہے وہ اتنا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اُڑی۔ لفّاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی۔ وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئی ❊

اس کی طبع آزمائی کا زور اب تک فقط چند مطالب میں محصور رہے۔ مضامینِ عاشقانہ گلگشتِ مستانہ۔ نصیبوں کا رونا۔ اُمیدِ موہوم پر خوش ہونا۔ امرا کی ثنا خوانی جس پر خفا ہوئے اُس کی خاک اُڑانی۔ البتّہ ان رنگوں میں اس نے لطافت اور نازک خیالی کو اس درجہ تک پہنچایا کہ حد سے گزار دیا۔ اور اس قسم کے الفاظ و مطالب کا عمدہ ذخیرہ اُس کے پاس ہے۔ فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں۔ جن کے خیالات باریکی اور نازکی عبارات میں جگنو سے اُڑتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں کوئی اصلی اجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں۔ ایسی ماں کا دودھ پی کر اُردو نے پرورش پائی تو اُس کا کیا حال ہوگا۔ اے اہلِ وطن۔ آج وہ دن ہے کہ علوم کے ایوانِ شاہانہ میں دربار لگا ہوا ہے۔ ہر ایک زبان اپنے اپنے ملک کی خدمتیں لیکر حاضر اور قدرت اور عظمت کے درجوں پر قائم ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری زبان کس درجہ پر کھڑی ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ نہایت ادنےٰ درجہ پر ہے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی ہے مگر کوئی بڑھانے والا نہیں۔ ہاں اُس کا بڑھنا تمہارے ہاتھ میں ہے ❊

زبان انگریزی بھی مضامین عاشقانہ۔ قصہ و افسانہ اور مضامینِ خیالی سے مالا مال ہے مگر کچھ اور ڈھنگ سے۔ اُس کا اصل اصول یہ ہے کہ جو سرگذشت بیان کرے اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے اور نشتر اُس کا دل پر کھٹکے۔ اسی واسطے خیالی پھول پتے اتنے ہی لگاتے ہیں جتنے اصل ٹہنیوں پر سجتے ہوں۔ نہ کہ شاخ و شجر سب غائب ہو جائیں۔ فقط پتّوں کا ڈھیر ہی رہ جائے۔ بیشک فنِ انشا اور لطفِ زبان تفریحِ طبع کا سامان ہے۔ لیکن جس طرح ہمارے متاخرین نے اسے ایک ہی مرض کی دوا سمجھ لیا ہے۔ انگریزی میں ایسا نہیں۔ اہل فرنگ نے جس طرح

ہر امر کی بنیاد ایک منفعت پر رکھی ہے۔ اسی طرح اس میں بھی موقع موقع سے مختلف منافع مدنظر رکھتے ہیں۔ زبان انگریزی میں نظم کا طور تو کچھ اور ہی ہے۔ مگر نثر میں بھی خیالی داستانیں یا اکثر مضامین خاص خاص مقاصد پر لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی وسعتِ خیال۔ اور پروازِ فکر۔ اور تازگیِ مضامین۔ اور طرزِ بیان کا انداز قابل دیکھنے کے ہے۔ مَیں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ شوق روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں اُن مطالب پر مشتمل ہیں۔ جنہیں یہاں (اِسے) جواب مضمون کہتے ہیں۔ ان میں انواع و اقسام کی غرضیں ملحوظ ہیں مگر بہت سے مضامین ایسے ہیں۔ جن کی روشنی ابھی ہمارے دل و دماغ تک نہیں پہنچی۔ بعض مضامین وہ ہیں۔ جن میں انسان کے قوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو لیا ہے۔ انہیں انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کیا ہے۔ اور اُن کے معاملات اور ترقی و تنزل کو سرگذشت کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان میں شگفتگیٔ طبع کے علاوہ یہ غرض رکھی ہے کہ پڑھنے والے کو کسی صفتِ پسندیدہ پر رغبت اور کسی خلق بد سے نفرت ہو یا کسی حصولِ مطلب کے رستہ میں جو نشیب و فراز آتے ہیں۔ اُن سے واقف ہو۔ اگرچہ ان میں طرزِ بیان کا طور وہ نہیں جو ہم اُردو فارسی میں پڑھتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی فصیح اُردو زبان پر قادر ہو۔ تو انہیں پڑھے۔ اور اُن کے رنگ سے اپنے کلام کے چہرۂ حال کو ایسے خط و خال سے آراستہ کرلے کہ خاص و عام کی نظروں میں کھب جائے۔ البتہ ایسی قدرت حاصل ہونی مشکل ہے! اور مشکل یہ ہے کہ انگریزی میں یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسوم قدیم کی باتیں اب تک انشا پردازی کا جزو ہیں۔ رومی و یونانی ستارہ ہائے فلکی اور اکثر قوائے روحانی کو دیوتا مانتے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں بڑے انشا پرداز وہی کہلاتے ہیں جن کی چشم سخن ہر بات میں اُن کے قصّوں پر اشارے کرتی جائے۔ مگر اُردو کے باغ نے فارسی و عربی کے چشموں سے پانی پایا ہے۔ وہاں دیوی دیوتا

کا گز نہیں۔ اور یہ سخت دشواری ہے کیونکہ اگر لکھنے میں کچھ تصرّف کریں تو ترجمہ نہ رہا۔ اور اصل کی رعایت کی۔ تو کتاب معمائے دقیق ہوگئی نہ کہ رفیق تفریح ٭

حق یہ ہے کہ مجھ نا قابل کو ایسے موقع پر قلم اُٹھانا اُن مضامین کو ذبح کرنا ہے۔ لیکن اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی۔ طوطے یا مینا کی زبانی سُنائیں۔ ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں۔ یا پریاں اُڑائیں۔ دیو بنائیں اور ساری رات اُن کی باتوں میں گنوائیں۔ اب کچھ اَور وقت ہے۔ اسی واسطے ہمیں بھی کچھ اَور کرنا چاہیئے۔ علوم فنون کے علاوہ ایسی تصنیفیں بھی چاہئیں جو صاف شفاف تصویریں رسوم و اخلاق کی ہمارے بزم کلام میں سجائیں۔ ان میں جو ہمارے داغ دھبّے ہیں۔ سب نظر آئیں۔ اور آب تاثیر سے دھوئے جائیں۔ تم دیکھتے ہو؟ بے جان مورتوں میں جان پڑنے کی ساعت آگئی ہے۔ قریب ہے کہ شائستہ زبانوں کی طرح ہماری زبان بھی جاں بخشی کی تاثیر پیدا کرے۔ اس تقریر سے یہ غرض نہیں کہ زبان کے کپڑے اُتار کر ننگا منگا کر دو۔ استعارہ اور تشبیہ کا نام نہ رہے۔ ہاں ایسے کپڑے پہناؤ کہ اصلی حسن کو روشن کردیں۔ نہ کہ اندھیر چھا جائے۔ کیونکہ اَور زبانوں میں کیا ہے۔ جو ہماری زبان میں نہیں۔ ہاں طرز بیان کا ایک ڈھب ہے۔ وہ تقریریں آجانا چاہیئے۔ فقط اتنی ہی کمی ہے ٭

اے جواہر زبان کے پرکھنے والو! میں زبانِ انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔ اُردو کے میدان میں بھی سوار نہیں پیادہ ہوں۔ اس لئے یہاں بھی درماندہ ہوں۔ پھر بھی بوالہوسی دیکھو کہ شہسواروں کے ساتھ دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ جتنا نالائق ہوں اُتنا ہی زیادہ شائق ہوں۔ دل سے لاچار ہوں کہ باوجود موانع مذکور کے جو لطف طبیعت کو بعض مضامین انگریزی سے حاصل ہوا۔ نہ چاہا کہ اپنے پیارے اہل وطن کو اس میں شامل نہ کروں۔ جس قدر ہوسکے اور جس طرح ہوسکے۔ ایک پرتو اُردو میں دکھانا چاہیئے۔ بالفرض

مجھ سے بیان کا حق نہ ادا ہوگا۔ایک رستہ تو نکل آئیگا۔زبان کے اہل ذوق بڑے بڑے صاحب قدرت ہیں اور ہونگے۔کوئی نہ کوئی منزل مقصود تک پہنچیگا۔

یہ چند مضمون جو لکھے ہیں۔نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں۔ہاں جو کچھ کانوں نے سُنا اور فکرِ مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ہاتھوں نے اُسے لکھ دیا۔اب حیران ہوں کہ نکتہ شناس اسے دیکھ کر کیا سمجھینگے۔اکثر نازک دماغ تو کہہ دینگے۔کہ واہیات ہے۔بہت کہینگے۔کوئی کہانی کہی ہے مگر مزا نہیں۔جو بڑے مُبصر ہیں وہ کہینگے کہ ہے مگر غور طلب ہے۔بیشک یہ کہنا اُن کا اصلیت سے خالی نہیں کیونکہ خیالی تصویریں حکمت و اخلاق کی ہیں۔فکر کے قلم نے خاکہ ڈالا ہے۔اور استعارہ اور تشبیہ نے رنگ دیا ہے۔طبیعتیں رستہ سے آشنا نہیں۔سبب یہ کہ ملک میں ابھی اس طرز کا رواج نہیں۔خیر **آزاد**! نا اُمید نہ ہونا چاہئے ؎

تمہاری سینہ نگاری کوئی تو دیکھیگا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے۔کبھی تو دیکھیگا

اُردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات

اگر زبان کو فقط اظہار مطالب کا وسیلہ ہی کہیں تو گویا وہ ایک اوزار ہے کہ جو کام ایک گونگے بچارے یا بچۂ نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں۔وہی اُس سے ہوتے ہیں۔لیکن حقیقت میں اس کا مرتبہ ان لفظوں سے بہت بلند ہے۔زبان حقیقت میں ایک معمار ہے کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعۂ فولادی تیار کردے جو کسی توپخانے سے نہ ٹوٹ سکے۔اور چاہے تو ایک بات میں اسے خاک میں ملادے۔جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کردیتا ہے۔اور جو اپنے

مقاصد چاہتا ہے۔ اُن سے حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ایک نادر مرصع کار ہے کہ جس کی دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج۔ اور کبھی شہزادیوں کے نولکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زر و جواہر اس کے قوم کو مالامال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیار ہے۔ جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے۔ اور دلوں کے قفل کھولتا اور بند کرتا ہے۔ یا مصوّر ہے کہ نظر کے میدان میں مرقع کھینچتا ہے۔ یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے۔ اور اُسے پھول۔ گل۔ طوطی و بلبل سے سجا کر تیار کر دیتا ہے۔ اس نادر دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح مُوقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن اس کے استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوشنما ہیں۔ کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال بھبھوکا کر دیتا ہے۔ پھر بے اس کے کہ بوند پانی اُس میں ڈالے۔ ایک ہی بات میں اُسے ایسا کر دیتا ہے کہ کبھی نارنجی۔ کبھی گلناری۔ کبھی آتشی۔ کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بوقلموں اور رنگارنگ۔ اور پھر سرتاپا عالم نیرنگ جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں۔ اس میں بڑے بڑے نازک قلم مصوّر گزر گئے ہیں۔ جن کے مرقعے آج تک آنکھوں اور کانوں کے رستہ سے ہمارے تمہارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل گویا اُن کے قلم گھس گئے ہیں اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہو گئی ہیں جس سے تمہاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مرقع تیار کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اور تعلیم یافتہ قومیں اُسے سُن کر کہتی ہیں۔ کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی ٭

میرے دوستو! یہ قول اُن کا حقیقت میں بیجا نہیں ہے۔ ہر ایک زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزت پاتی ہے تو دو سبب سے پاتی ہے۔ اوّل یہ کہ اُسکے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں۔ دوم اس کی انشاپردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوت

رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دونو صفتیں ہیں مگر ناتمام ہیں اور اسکے سبب ظاہر ہیں ؎

علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں جو وہ مفلس ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تم جانتے ہو۔ کل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اُسکی ولادت کو ہوئے۔ اس کا نام اُردو خود کہتا ہے کہ میں علمی نہیں۔ بازار کی زبان ہوں۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ لین دین کی باتوں کے لئے کام میں آتی ہوں۔ سلاطین چغتائیہ کے وقت تک اس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک بچہ شاہجہاں کے گھر میں پیدا ہو۔ اور انگریزی اقبال کے ساتھ اُس کا ستارہ چمکے۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے تو انہوں نے مُلکی زبان سمجھ کر اس کے سیکھنے کا ارادہ کیا۔ مگر سوا چند دیوانوں کے اس میں نثر کی کتاب تک نہ تھی۔ ان کی فرمائش سے کئی کتابیں کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں تصنیف ہوئیں۔ اور اُنہی کے ڈھب کی صرف و نحو بھی درست ہوئی ۱۸۳۵ء سے دفتر بھی اُردو ہونے شروع ہوئے ۱۸۳۶ء میں ایک اُردو اخبار جاری ہوا ۱۸۴۲ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں۔ اور اُردو نے برائے نام زبان کا تمغہ اور سکّہ پایا۔ اب خیال کرنا چاہئے کہ جس زبان کی تصنیفی عمر کل ۷۰-۷۲ برس کی ہو۔ اس کی بساط کیا؟ اور اس کے الفاظ کے ذخیرہ کی کائنات کیا؟ پس اس وقت ہمیں اس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ ہونا نہ چاہئے ؎

میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مفلس یا صاحب سرمایہ کہنا بیجا ہے۔ ہر زبان اہل زبان کے باعلم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے اور کسی ملک والے کا یہ کہنا کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی ملک کے الفاظ بولیں۔ بالکل بے جا ہے ؎

عربی زبان بھی ایک علمی زبان تھی۔ مگر دیکھ لو۔ اس میں سارے لفظ تو عربی نہیں۔ صدہا رومی۔ صدہا یونانی۔ صدہا فارسی کے لفظ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور زبان فارسی کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ انگریزی زبان آج علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے۔ مگر اس میں

بھی غیر زبان کے لفظوں کا طوفان آرہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اہل ملک میں علم آتا ہے پھر علمی اشیا کے لئے الفاظ یا تو اُس علم کے ساتھ آتے ہیں یا وہیں ایجاد ہو جاتے ہیں۔ علمی الفاظ کا ذخیرہ خدا نے بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ کوئی صاحب علم پہلے سے تیار کر کے رکھ گیا۔ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں۔ ویسے ہی اُن کے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اوّل خاص و عام میں علم پھیلتا ہے۔ ساتھ ہی اُس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں۔ مثلاً ریل کا انجن اور اُس کے کارخانہ کے صدہا الفاظ ہیں کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ کارخانے ہوئے تو ادنےٰ ادنےٰ ناخواندے سب جان گئے۔ اگر بے اسکے وہ الفاظ یہاں ڈھونڈھتے یا پہلے یاد کرواتے تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ اسی طرح مثلاً میجک لینٹرن اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا۔ خواہ اس کا یہی نام لیں خواہ فانوس جادو کہیں۔ خواہ اچنبھے کا تماشا کہیں۔ ہرگز کوئی نہیں سمجھیگا۔ لیکن اگر وہ مشاہدہ میں عام ہو جائے۔ اور گھر گھر میں جاری ہو جاے۔ تو اُلٹے سے اُلٹا اُس کا نام رکھ دیں۔ وہی بچہ بچہ کی زبان پر مشہور ہو جائیگا۔ اور وہی سب سمجھینگے۔ انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں مثلاً ٹیلیگراف یا ایلکٹریسٹی وغیرہ وغیرہ۔ ان میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ اپنے اصل معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے۔ مگر چونکہ ملک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں۔ اس لئے الفاظ مذکورہ بھی ایسے عام ہیں کہ سب بے تکلف سمجھتے ہیں۔ پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے تو اس سبب سے ہے کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی۔ اور اسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی۔ اب اس کی تدبیر ہو سکتی ہے تو اہل ملک ہی سے ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ خود علوم و فنون حاصل کرو۔ اپنے ملک میں پھیلاؤ۔ اور بھائی بندوں کو اُس سے آگاہ کرو۔ جب اس میں سب قسم کے کاروبار ہونگے تو اُن کے الفاظ بھی ہونگے۔ ملک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مٹ جائیگا ؂

تمہاری انشا پردازی پر جو نقص کا الزام ہے۔ وہ بھی کچھ درست ہے۔ اور کچھ قابل چشم پوشی کے ہے۔ یہ تو ابھی بیان ہوا کہ زبان مذکور علمی زبان نہیں سو برس ہوئے کہ ہندوستان کے رنگیں مزاجوں نے فقط اس حب الوطنی سے کہ ہماری زبان بھی اور زبانوں کی طرح نظم سے خالی نہ ہو۔ اس میں اپنی مرصع کاری اور نقش نگاری دکھانی شروع کی۔ اور حق یہ ہے کہ سنہ ۱۲۱۵ ہجری تک جو کچھ زور اس نے پایا انہی کی بدولت پایا۔ انشا پردازی کا قاعدہ ہے کہ ابتدا میں جو مطالب کسی زبان میں ادا ہوتے ہیں تو اُن میں سیدھی سادی تشبیہیں اور قریب قریب کے استعارے خرچ ہوتے ہیں۔ اسی واسطے جو مطالب اس میں ادا کئے جاتے ہیں وہ سنتے ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس پاس کے استعارے اور اُن چیزوں کی تشبیہیں جو آنکھوں کے سامنے ہمارے آس پاس موجود ہیں۔ وہ فقط مطلب مذکور کو سمجھاتے ہی نہیں بلکہ اپنی رنگینی اور لطافت سے اُس کے لطف کو روشن کر کے دکھاتے ہیں۔ اور چونکہ سادگی اور آسانی کے سبب سے انہیں سب سمجھتے ہیں۔ اس لئے سب کے دل اس کی تاثیر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چند روز کے بعد قریب قریب کی تشبیہیں اور استعارے تو خرچ ہو جاتے ہیں اور آس پاس کی تشبیہیں عام تام ہو کر تمام ہو جاتی ہیں۔ نئی نسلیں ونسال تشبیہوں اور استعاروں کو برتنا۔ چبائے ہوئے نوالے کا چبانا سمجھتی ہیں لیکن علم اور شوق جو مختلف رستوں سے آگاہ کر دیتے ہیں اس لئے اُن کے فکر کبھی دائیں بائیں پھیلتے ہیں اور کبھی بلند ہونا شروع کرتے ہیں اور دُور دُور ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ فارسی اور اُردو زبان میں جو کیفیت اس کی گزری ہے اس وقت میں اسی کا اشارہ کرتا ہوں کہ شعرا نے مستعمل استعاروں سے بچنے کے لئے استعارہ اور استعارہ در استعارہ نکالا۔ اور اسے ایک ایجاد دلپذیر تصور کر کے نازک خیالی نام رکھا۔ چونکہ دُنیا میں ہر ایک نئی چیز بہت مزا دیتی ہے۔ اس لئے اَوروں نے بھی اسے پسند کیا اور علم کی شکل پسندی

نے اسے زیادہ فوقت دی۔ اور یہ معاملہ روز بروز زور پکڑتا گیا۔ چنانچہ ان بلند خیالوں میں دنیا کے کاروبار شلاً خط و کتابت یا تاریخی مقاصد یا علمی مطالب کا ادا کرنا تو بہت دشوار تھا۔ مگر ایک فرقہ پیدا ہوا جنھوں نے خیال بند کا خطاب حاصل کیا۔ انہی کی نثر میں پنجرقعہ۔ مینا بازار۔ چار عنصر وغیرہ اور نظم میں جلال اسیر۔ قاسم مشہدی۔ بیدل۔ ناصر علی اور ان کے مقلدوں کے دیوان موجود ہیں۔ چنانچہ دونو کے امتیاز کے لئے دو شعر بھی اس مقام پر لکھتا ہوں۔ پہلے طریقہ میں ایک استاد کہتا ہے :-

سحر خورشید لرزاں بر سر کوئے تو مے آید
دل آئینہ را نازم کہ بر روئے تو مے آید

دیکھو ناصر علی سرہندی اسی مضمون کو اپنی نازک خیالی کے زور سے الگ کرتے ہیں :-

نیارد چشم بیدل تاب حسن بے حجابش را	کہ باشد صافیٔ آئینہ شبنم آفتابش را

چونکہ اردو نظم نے فارسی کا دودھ پی کر پرورش پائی تھی۔ اس لئے چند روز کے بعد یہی وقت اسے بھی پیش آئی۔ میر سوز۔ میر تقی۔ سودا۔ جرأت وغیرہ کے زمانے تھے۔ ان میں اگرچہ مضامین شاعرانہ تھے مگر زبان میں ابتدائی خوبی موجود تھی۔ بعد ان کے وہی استعاروں کے اینچ پینچ اور خیالوں کی معمولی ترقی شروع ہوئی۔ البتہ خال خال آدمی ایسے رہے جو بزرگوں کی تقلید سے صفائی اور سادگی کی لکیر پر فقیر رہے۔ مثلاً قدما میں خواجہ میر درد کا شعر ہے :-

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو	دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

متاخرین میں غالب نازک خیال اس سے الگ ہو کر کہتے ہیں :-

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک	میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

بہرحال ہمیں شعرا کا ممنون ہونا چاہئے کہ جو کچھ لطافت یا زور ہماری زبان میں پیدا ہوا انہیں کی برکت سے ہوا۔ مگر وہ عاشقانہ مضامین کے ادا کرنے کے سامان اور غزل کے خوشنما انداز۔ اور اس کے الفاظ اور ترکیبوں کی دل آویز تراشیں تھیں۔ بھلا

خیالات فلسفہ کے سامان علوم کی اصطلاحیں۔ مختلف مضامین تاریخی کے ادا کی طاقت۔ دلائل و براہین کے لڑانے کے زور اُس میں کہاں سے آتے۔ اگرچہ ابتدا میں جو کچھ تھا۔ یہ رنگ بہت خوشنما تھا۔ مگر اب دیکھتا ہوں تو زمانے کے انداز نے اُسے بھی پھیکا کر دیا ہے۔ اور تمہاری انشا پردازی کا یہ حال ہو گیا ہے کہ غیر قومیں تو جو کچھ کہیں۔ بجا ہے۔ میں خود دیکھتا ہوں۔ اور شرماتا ہوں۔ کیونکہ مستعمل چیزیں میں شگفتگی اور تازگی دکھائی بہت مشکل ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ ایک خزانہ مصوّری کا تمہارے ہاتھ آگیا ہے۔ مگر اتنا ہے کہ وہ انگریزی قفلوں میں بند ہے۔ جس کی کنجی انگریزی زبان ہے +

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح ہم فارسی۔ عربی کے الفاظ اُردو میں بولتے ہیں اسی طرح انگریزی الفاظ بولنے لگیں۔ یا اُن کے محاوروں اور اصطلاحوں کے ترجمے اُردو میں استعمال کرنے لگیں۔ لیکن تم خیال کرو کہ عبارت و الفاظ حقیقت میں انسان کے خیالات اور مقاصد کے لباس ہیں۔ اور چونکہ طبعی خیال فرقہائے انسان کے ہمیشہ قریب قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ جس ملک میں جا ہیں رنگِ ظہور دکھائیں۔ اصلیت میں کچھ نہ کچھ ملتے جلتے ہی ہونگے۔ بلکہ اُن میں بعض ڈھنگ ایسے ہونگے کہ ذرا رنگ پلٹ کر چاہینگے۔ تو دوسری طرف آجائینگے۔ اور نئی بہار دکھائینگے۔ چنانچہ جب بنظرِ غور دیکھینگے۔ تو معلوم ہوگا کہ دو قوموں کے ارتباط سے ہمیشہ ایک زبان دوسری زبان سے پرتو لیتی رہی ہے۔ دیکھ لو۔ بھاشا پر جب فارسی۔ عربی آکر گری تو اس کا کیا اثر ہوا۔ اور اب انگریزی کیا اندرونی اثر کر رہی ہے۔ فارسی اُردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہوگا کہ زمانہ یا زندگی کو عمرِ رواں یا آبِ گزراں کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھیتی کو یا رسنِ عمر کو کاٹ رہا ہے۔ اور یہ بھی کہ مصرع

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اسی طرح غصّے کے باب میں دیکھا ہوگا کہ اسے آتشِ غضب کہہ کر آگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہمچو مار سیاہ بر خود پیچید۔ اور کبھی جوش غضب کے لئے کہتے ہیں کہ آتش از چشمش پرید۔ دود از نہادش بر آمد۔ اور ہمچو سپند از جا برجست۔ پس انگریزی میں متھالیجی ایک خاص علم ہے کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسّم دیبی یا دیوتا مقرر کیا ہے۔ اور اُنہی سامانوں سے سجایا ہے۔ جو اُن کے لئے لازم اور شایاں ہیں۔ چنانچہ :-

وقت

ایک پیر کہن سال کی تصویر ہے۔ اس کے بازوؤں میں پریوں کی طرح پر پرواز لگے ہیں کہ گویا ہوا میں اُڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ میں شیشۂ ساعت ہے کہ جس سے اہل عالم کو اپنے گزرنے کا اندازہ دکھاتا جاتا ہے۔ اور ایک میں درانتی ہے کہ لوگوں کی کشت اُمید یا رشتۂ عمر کو کاٹتا جاتا ہے۔ یا ظالم خونریز ہے کہ اپنے گزرنے میں ذرا رحم نہیں کرتا۔ اُس کے سر پر ایک چوٹی بھی رکھی ہے کہ جو دانا ہیں۔ اُسے پکڑ کر قابو میں کر لیتے ہیں لیکن اَوروں کی چوٹیاں پیچھے ہوتی ہیں۔ اس کی چوٹی آگے رکھی ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ جو وقت گزر گیا۔ وہ قابو میں نہیں آسکتا۔ ہاں جو پیش بین ہو۔ وہ پہلے ہی سے روک لے سو روک لے ٭

غُصّہ

ایک عورت ہے۔ کالا رنگ۔ ڈراؤنی صورت۔ تمام بدن پر بال کھڑے ہیں جیسے لوہے کی سلاخیں۔ سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اُٹھائے لہرا رہے ہیں۔ اور آنکھوں سے خون برستا ہے ٭

بعض تصویروں میں اس کے دو پر ہیں کہ اُڑائے لئے جاتے ہیں۔ اور اسکے ہاتھ میں شعلۂ آتش ہے کہ دم بدم بھڑکتا چلا جاتا ہے اور ایک ہاتھ میں خونریزی کا

برچھا ہے ؎

عشق

ایک موقع پر اسے نوجوان - خوبصورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے اور اپنے عالم میں اُچھلتا کودتا ہے - مگر آنکھوں سے اندھا رکھا ہے! اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی برائی کو نہیں سوچتا ؎

کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے - اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر جوڑا ہوا ہے - کہ جادھر چاہتا ہے - مار بیٹھتا ہے - اُس کی پناہ نہیں ؎

ایک موقع پر ایسی تصویر کھینچی ہے کہ پہلو میں تیروں کا ترکش لٹکتا ہے - اور ہاتھ سے تیر کا پیکان سان پر تیز کر رہا ہے ؎

یہ تصویر ایک ہیرے پر کھدی ہوئی ہاتھ آئی تھی - خدا جانے کس عہد میں کھدی ہوگی - اور کیا طلسم اس میں باندھا ہوگا ؎

افواہ یا شہرت

اس کی تصویر دیکھی - ایک بڑھیا عورت ہے کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں - پہلے اُس کے منہ میں زبان ہلتی ہے - ساتھ ہی ساری زبانیں سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں - اشارہ یہ ہے - کہ جو بات اسکی زبان سے نکلتی ہے - وہی عالم میں ایک ایک کی زبان پر آتی ہے ؎

حسن کی پری

سمندر کے کف سے پیدا ہوئی ہے - شاید اس سے جوش و خروش کے ساتھ اس کی لطافت اور نزاکت کا بھی اشارہ ہو - وہ خود بھی محبت رکھتی ہے مگر لڑائی کے دیوتا پر عاشق ہے - جس کہ وہ نصیب ہوجائے - وہ اس کے پرنوجمال سے کامیاب ہو - پھولوں میں مہندی - گلاب - سیب - لالہ - نافرمان وغیرہ سے اُس کی درگاہ میں نذر چڑھتی ہے - فاختہ - ہنس - ابابیل - ہُدہُد

وغیرہ اُس کے تحت کو اُڑاتے ہیں۔ خوشبوؤں کی دھونی اور پھولوں کے
ہار اس کا متبرک چڑھاوا ہے ٭

انگریزی میں انہیں گاڈز کہتے ہیں۔ اور ہر ایک جذبہ انسانی بلکہ خزاں
اور بہار اور موسیقی وغیرہ وغیرہ کے لئے مختلف گاڈز تیار کئے ہیں۔ زمانے
کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹا دیا۔ اس لئے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی
ہیں ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیا کے لئے ایک ایک دیبی یا دیوتا ہیں ٭

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات
میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں اور اس کے صنائع
و بدائع پر نظر کریں تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کونسا صانع ہوگا جو ایسی دستکاری
کر سکے۔ پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو۔ اور اسی نسبت سے تمام عالم موجودات اور
اُس کے جزئیات کو دیکھو۔ پھر جب دیکھتے ہیں کہ اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ عَنْہُ
اِلَّا الْوَاحِدُ یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے تو
ضرور ہے کہ کائنات کے مختلف کارخانوں کے لئے ایک ایک رب النوع فرض
کیا جائے جو اپنے کارخانے کا سربراہ ہو۔ اور سب کا مالک رب الارباب
جامع جمیع صفات کمال۔ اہل شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک
فرشتہ مُوکل مانا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے۔ ورنہ وہی دیبی
یا دیوتا۔ وہی گاڈز۔ وہی رب النوع۔ وہی فرشتہ موکل۔ یہ خیال مُدت سے
دل میں کھٹکتا تھا۔ چند روز ہوئے کہ شاہ ایران نے جو سفرنامہ یورپ کا آپ
لکھا ہے۔ وہ میری نظر سے گُزرا۔ فرانس کے معنی آفرینوں نے ایک جگہ باغ رنگین
میں ایک نقلی پہاڑ بنایا ہے۔ اور اُس پر بہار کی گاڈس سجائی ہے۔ چنانچہ شاہ نے
وہاں پہنچ کر اُسے دیکھا ہے۔ اور اپنے بیان میں اسے رب النوع ہی لکھا ہے ٭

غرض یہ ہے کہ خیالات کے اتفاقوں کو غور سے دیکھو کہ فقط طبیعت کی تاثیر

ہے۔ جس نے مختلف ملکوں میں مختلف طور پر طبیعتوں کے جوش ظاہر کئے ہیں مگر سب کارستہ کسی قدر قریب قریب ہو کر نکلا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ جب ایک جذبۂ موہوم کو مجسّم فرض کرتے ہیں۔ اور اُسکی صفات اور لوازمات کو آنکھوں کے سامنے سجاتے ہیں۔ تو اس پر طبیعت کی تاثیر پوری پوری قائم ہوتی ہے۔ اور جو خیالات اس پر نکلتے ہیں۔ ٹھیک درستی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور برجستہ الفاظ میں ادا ہوتے ہیں کہ یہی انشا پردازی کا ایمان ہے۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے پہلے انداز پرانے اور مستعمل ہو گئے۔ تو ہمیں چاہیئے۔ کہ انگریزی کے باغ میں سے نئے پودے لے کر اپنا گلزار سجائیں۔ البتہ دونو زبانوں میں ایسی مہارت ہونی چاہیئے کہ یہ تصرف خوبصورتی کے ساتھ ہو سکے۔ جیساکہ ابتدا میں ہماری اُردو فارسی کے انشا پرداز کر گئے۔ اور پھر کہتا ہوں کہ یہ مطلب جب کبھی ہوگا۔ اُن انگریزی دانوں سے ہوگا جو دونو زبانوں میں پوری مہارت رکھتے ہونگے۔ کیونکہ اُن کی دو آنکھیں روشن ہیں۔ اُردو اپنی زبان ہے اور انگریزی کنجی خدا نے دی۔ ہم اور ہمارے ساتھی پُرانی لکیروں کے فقیر۔ جو کچھ کرنا تھا سو کر چکے۔ نہ ان میدانوں میں اب ہم سے کچھ ہو سکے۔ چقماق کے دونو جزوں کو ٹکراؤ کہ آگ نکلے۔ اُون اور شیشہ کو رگڑو۔ کہ ایلکٹریسٹی کے فوائد حاصل ہوں۔ لیکن فقط پتھر ہو تو پتھر ہی ہے۔ اور فقط شیشہ۔ ڈر کا گھر۔ اپنی زبان کے زور سے اس میں اس طرح جان ڈالو کہ ہندوستانی کہیں۔ سوداؔ اور میرؔ کے زمانہ نے عمر دوبارہ پائی۔ اس پر انگریزی روغن چڑھا کر ایسا خوشرنگ کرو کہ انگریز کہیں۔ ہندوستان میں شیکسپیر کی رُوح نے ظہور کیا +

آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا

سیر کرنے والے گلشن حال کے اور دور بین لگانے والے ماضی اور استقبال کے روایت کرتے ہیں کہ جب زمانہ کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا۔ اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا۔ تو تمام اولادِ آدم مسرتِ عام اور بےفکری مدام کے عالم میں بسر کرتے تھے۔ ملک ملکِ فراغ تھا اور خسرو آرام رحمدل فرشتہ مقام گویا اُن کا بادشاہ تھا۔ وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا۔ نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا۔ اُس کی اطاعت اور فرمانبرداری اسی میں ادا ہو جاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی گلزاروں میں گلگشت کرتے تھے۔ ہری ہری سبزہ کی کیاریوں میں لوٹتے تھے آب حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے۔ ہمیشہ وقت صبح کا اور سدا موسم بہار کا رہتا تھا۔

نہ گرمی میں تہ خانے سجانے پڑتے نہ سردی میں آتشخانے روشن کرتے۔ قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوتیں ایسی موافق پڑی تھیں کہ جاڑے کی سختی یا ہوا کی گرمی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے۔ چلتے چشموں پر لوگ جھکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے۔ وہ شربت سے سوا مزا اور دودھ سے زیادہ قوت دیتے تھے۔ جسمانی قوت ہاضمہ کے ساتھ رفیق تھی۔ بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا۔ کہ سیدھے سادے کھانے اور جنگلوں کی پیداواریں رنگارنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے۔ آب و ہوا قدرتی غذائیں تیار کرکے زمین کے دسترخوان پر چن دیتی تھی۔ وہ ہزار مقوی اور مفرح کھانوں کے کام دیتی تھی۔ صبا و نسیم کی شمیم میں ہوائی خوشبوئیوں کے عطر مہک رہے تھے۔ بلبلوں کے چہچہے۔ خوش آواز جانوروں کے زمزمے سُنتے تھے۔ خوبصورت

چرند پرند اس پاس کلیل کرتے پھرتے تھے۔ جابجا درختوں کے جھرمٹ تھے۔ انھی کے سائے میں سب چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش و آرام کے قدرتی سامان اس بہتات سے تھے۔ کہ ایک شخص کی فراوانی سے دوسرے کے لئے کمی نہ ہوتی تھی۔ اور کسی طرح ایک سے دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا۔ سب کی طبیعتیں خوشی سے مالا مال اور دل فارغ البال تھے ؛

دیکھو اب انسان کی نیت میں فرق آتا ہے اور کیا جلد اس کی سزا پاتا ہے

اتفاقاً ایک میدان وسیع میں تختہ پھولوں کا کھلا کہ اس سے عالم مہک گیا۔ مگر بو اس کی گرم اور تیز تھی۔ تاثیر یہ ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں بدل گئیں۔ اور ہر ایک دل میں خود بخود یہ کھٹک پیدا ہوئی۔ کہ سامان عیش و آرام کا جو کچھ ہے میرے ہی کام آئے۔ اور کے پاس نہ جائے۔ اس غرض سے اس گلزار میں گلگشت کے بہانے کبھی تو فریب کے جاسوس اور کبھی سینہ زوری کے شیاطین آکر چالاکیاں دکھانے لگے۔ پھر تو چند روز کے بعد کھلم کھلا ان کی ذریات یعنی غارت۔ تاراج۔ لوٹ مار آن پہنچے اور ڈاکے مارنے لگے۔ جب راحت و آرام کے سامان یوں پیدا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ غرور۔ خود پسندی۔ حسد نے اس باغ میں آکر مقام کر دیا۔ ان کے اثر صحبت سے لوگ بہت خراب ہوئے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ دولت کا پیمانہ لائے۔ پہلے تو خدائی کے کارخانے فارغ البالی کے آئین اور آزادی کے قانون کے بموجب کھلے ہوئے تھے۔ یعنی عیش وافر اور سامان فراواں جو کچھ درکار ہو۔ موجود تھا۔ اور اسی بے احتیاطی کو لوگ تونگری کہتے تھے۔ پھر یہ سمجھنے لگے۔ کہ اگر ہمارے پاس ہر شئے ضرورت سے زیادہ ہو۔ اور ہمیں اس کی حاجت بھی ہو یا نہ ہو۔ لیکن تونگر ہم جبھی ہونگے۔ جب کہ ہمسایہ ہمارا محتاج ہو۔ ہر چند اس بیچارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدت سے زیادہ سامان لینا پڑا ہو۔ مگر انہیں جب ہمسائے خوشحال نظر آتے

تھے تو جل جاتے تھے۔ اور اپنے تئیں محتاج خیال کرتے تھے ٭

جہاں لوٹ مار اور غارت و تاراج کا قدم آتے وہاں احتیاج و افلاس نہ ہو تو کیا ہو

اس بدنیتی کی سزا یہ ہوئی کہ **احتیاج** اور **افلاس** نے بزرگانہ لباس پہنا۔ اور ایک پیرزادے بن کر آئے۔ حضرت انسان کہ طمع خام کے خمیر تھے خسرو آرام کی عقیدت کو چھوڑ کر اُن کی طرف رجوع ہوئے۔ چنانچہ سب اُن کے مرید اور معتقد ہو گئے۔ اور ہر شخص اپنے تئیں حاجتمند ظاہر کر کے فخر کرنے لگا۔ مقام افسوس یہ ہے کہ اس بدنیت نحس قدم کے آنے سے **ملک فراغ** کا رنگ بالکل بدل گیا یعنی انواع و اقسام کی حاجتوں نے لوگوں کو آن گھیرا۔ سال میں چار موسم ہو گئے۔ زمین بنجر ہو گئی۔ میوے کم ہونے لگے۔ ساگ پات اور موٹی قسم کے نباتات پر گزران ٹھیری۔ خزاں کے موسم میں کچھ بُرے بھلے اناج بھی پیدا ہونے لگے۔ لیکن جاڑے نے بالکل ناچار کر دیا۔ کبھی کبھی **قحط سالی** کا ٹڈی دل چڑھ آتا۔ اسی لشکر میں **وبا** اور **امراض** غول کے غول بیماریاں اپنے ساتھ لیکر آتے۔ اور تمام ملک میں پھیل جاتے۔ غرض عالم میں ایسا تہلکہ پڑا کہ اگر **ملک فراغ** کے انتظام میں نئی اصلاح نہ کی جاتی تو یک قلم برباد ہو جاتا۔ سب دُکھ تو سہہ سکتے تھے۔ مگر **قحط** کی مُصیبت غضب تھی۔ چونکہ یہ ساری نحوستیں **احتیاج** اور **افلاس** کی نحوست سے نصیب ہوئی تھیں اس لئے سب اپنے کئے پر بہت پچتائے ٭

اب پچتانے سے کیا حاصل ہے۔ ہاں ہمت کرو۔ اور محنت پر کمر باندھو

عالم کا رنگ بیرنگ دیکھ کر تدبیر اور مشورہ دو تجربہ کار دُنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ اور ایک سیب کے درخت میں جھولا ڈالے الگ باغ میں جھولا کرتے تھے۔ البتہ جو صاحب ضرورت اُن کے پاس جاتا۔ اُسے صلاح مناسب بتا دیا کرتے تھے۔ یہ سب مل کر اُن کے پاس گئے کہ برائے خدا کوئی ایسی راہ نکالئے جس سے **احتیاج** و **افلاس** کی بلا سے بندگانِ خدا کو نجات ہو۔ وہ بہت خفا ہوئے

اور کہا کہ اپنے کئے کا علاج نہیں۔ خسرو آرام ایک فرشتہ سیرت بادشاہ تھا۔ تم نے اس کا حق شکرانہ ادا نہ کیا۔ اور اس آفت کو اپنے ہاتھوں سر پر لیا۔ یہ افلاس ایسی بُری بلا ہے کہ انسان کو بیکس اور بے بس کر دیتی ہے مانگے تانگے کے سوا خود اس کا کچھ پیشہ نہیں۔ دیکھو اس نے ملک فراغ کو کیسا تباہ کر دیا۔ ہے کہ دِلوں کے باغ ہرے بھرے ویران ہوئے جاتے ہیں۔ اب اس کے نکلنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر یہ کہ ہم نے سُنا ہے۔ احتیاج و افلاس کا ایک بیٹا بھی ہے جس کا نام محنت پسند خردمند ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ کچھ اَور ہے۔ کیونکہ اُس نے اُمّید کا دُودھ پیا ہے۔ ہنرمندی نے اُسے پالا ہے۔ کمال کا شاگرد ہے۔ ہو سکے تو جا کر اُس کی خدمت کرو۔ اگرچہ اسی کا فرزند ہے لیکن اوّل تو سلطنت کا مقدمہ درمیان ہے۔ دوسرے ماں کے دودھ کا زور اُس کے بازوؤں میں ہے۔ اُستاد کی پھرتی اور چالاکی طبیعت میں ہے۔ شاید کچھ کر گزرے تدبیر اور مشورہ کا سب نے شکریہ ادا کیا۔ اور سیدھے محنت پسند خردمند کے سُراغ پر آئے۔ دامن کوہ میں دیکھا کہ ایک جوان قوی ہیکل کھڑا ہے۔ چہرہ اس کا ہوا سے جھریایا ہوا۔ دُھوپ سے تمتمایا ہوا۔ مشقت کی ریاضت سے بدن اینٹھا ہوا۔ پسلیاں اُبھری ہوئیں۔ ایک ہاتھ میں کچھ کھیتی کا سامان۔ ایک ہاتھ میں معماری کے اوزار لئے ہانپ رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ ابھی ایک بُرج کی عمارت[1] کی بنیاد ڈالی ہے۔ سب نے جھک کر سلام کیا۔ اور ساری داستان اپنی مُصیبت کی سُنائی ؂

وہ انہیں دیکھتے ہی ہنسا اور ایک قہقہہ مار کر پکارا کہ آؤ انسانو نادانو۔ آرام کے بندو۔ عیش کے پابندو۔ آؤ آؤ۔ آج سے تم ہمارے سپرد ہوئے۔ اب تمہاری خوشی کی اُمید اور بچاؤ کی راہ اگر ہے تو ہمارے ہاتھ ہے۔ خسرو آرام ایک کمزور۔ کام چور۔ بے ہمت۔ کم حوصلہ۔ بھولا بھالا۔ سب کے منہ کا نوالہ تھا۔ نہ تمہیں سنبھال سکا۔

[1] اس عمارت سے گویا دہی کاروبار مراد ہیں انہی میں آیندہ یہ لوگ گزران کر کے اپنی قسمت کا لکھا پورا کرینگے ؂

نہ نصیبت سے نکال سکا۔ بیماری اور قحط سالی کا ایک ریلا بھی نہ ٹال سکا۔ پہلے ہی حملے میں نہیں چھوڑ دیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پھر مُڑ کر نہ دیکھا۔ سلطنت کو ہاتھ سے کھویا۔ اور تم کو مانجھدھار میں ڈبویا۔ آج سے تم ہماری خدمت میں حاضر رہو۔ اور ہماری آواز پر آیا کرو۔ ہم تمہیں ایسی ایسی تدبیریں سکھائینگے کہ جس سے یہ شوریت زمین کی دُور ہو جائیگی۔ ہوا کی شدّت اعتدال پائیگی۔ گرمی سے سردی کی خوراک نکل آئیگی۔ ہم تمہارے لئے پانی سے مچھلی۔ ہوا سے پرندے۔ جنگل سے چرندے نکالینگے۔ زمین کا پیٹ چاک کر ڈالینگے اور پہاڑوں کی انتڑیاں تک نکالینگے۔ ایسے ایسے دھات اور جواہرات دینگے۔ کہ تمہارے خزانوں کے لئے دولت ہو۔ ہاتھوں میں طاقت ہو۔ اور بدن کی حفاظت ہو۔ زبردست حیوانوں کے شکار کروگے۔ اور اُن کے آزاروں سے محفوظ رہوگے۔ جنگل کے جنگل کاٹ ڈالوگے۔ پہاڑ کے پہاڑ اُکھاڑ دوگے۔ تم دیکھنا۔ میں زمانہ کو وابستۂ تدبیر اور تمام عالم کو اپنے ڈھب پر تسخیر کرلونگا۔ غرض اِن باتوں سے سب کے دلوں کو لُبھا لیا۔ وہ بھی سمجھے کہ محنت پسند خردمند بنی آدم کا خیرخواہ اور ہمارا دِلی دوست ہے۔ ہاتھ جوڑ جوڑ اسکے پاؤں پر گرے۔ ہمت اور تحمّل اس کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اسی وقت انہیں جماعت مذکور پر افسر کر دیا +

اے حضرت انسان! قدرتی گلزاروں کی بہار تو دیکھ چکے۔ اب اپنی دستکاری کی گلکاری دیکھو

الغرض ہمت اور تحمّل ان سب کو جنگلوں اور پہاڑوں میں لے گئے۔ کانوں کا کھودنا۔ اُتار چڑھاؤ کا ہموار کرنا تالابوں سے پانی سینچنا۔ دریاؤں کی دھاروں کا رُخ پھیرنا سب سکھایا۔ لوگوں کے دِلوں پر اس کی بات کا ایسا اثر ہوا تھا کہ سب دفعۃً کمریں باندھ آنکھیں بند کر دیمک کی طرح روے زمین کو لپٹ گئے +

عالمِ صورت چند روز میں رنگ نکال لایا۔ مگر نئے ڈھنگ سے یعنی ساری زمین شہر قصبوں اور گاؤں سے بھر گئی۔ کھیت اناج سے اور باغ میوؤں سے مالامال ہو گئے۔ شہروں میں بازار لگ گئے۔ عمارتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ گھر آباد

ہو گئے۔ جدھر دیکھو۔ ڈالیوں اور گلزاروں میں میوے دھرے۔ دسترخوان گھروں میں بچھے۔ ذخیرے غلّوں سے بھرے۔ کیا گھر کیا باہر اس کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ غرض محنت پسند خردمند نے اس فرمانبردار رعیّت کی بدولت یہ کامیابیاں اور فتوحات نمایاں حاصل کر کے **سلطان محنت پسند** کا لقب حاصل کیا۔ اور جا بجا ملک اور شہر قائم کر کے اپنی سلطنت جمائی *

اے محنت کشو! محنت کی بھی ایک حد ہے۔ آفرا ایسا تھکو گے کہ گر پڑو گے

سلطان محنت پسند اپنے ملک میں ہمیشہ دورہ کرتا رہتا تھا۔ اتفاقاً اس کی سواری ایک کوہستان میں گزری۔ وہاں میووں کی بہتات پانی کے چشمے جیسے آب حیات۔ ہرے ہرے سبزے۔ درختوں کے سائے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں خوبصورت خوبصورت جانور کلیلیں کر رہے تھے۔ یہ جگہ بہت بھائی۔ چاہا کہ کوئی دم ٹھیرے اور دم لے۔ اتفاقاً وہاں ایسی ایک قوم سے سامنا ہو گیا جن کی کثرت و انبوہ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ مگر سب کے سب ضعف و ناطاقتی سے زمین میں بچھے جاتے تھے۔ ان میں **تھکن اور سستی** کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اور ناتوانی ان پر سردار تھی۔ صورت اس کی یہ کہ آنکھیں بیٹھی ہوئی۔ چہرہ مرجھایا ہوا۔ رنگ زرد منہ پر جھرّیاں پڑی۔ کمر جھکی۔ گوشت بدن کا خشک۔ ہڈیاں نکلی ہوئی۔ غرض دیکھا کہ سب ہانپتے کانپتے۔ روتے بسورتے۔ آہ آہ کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کی آوازیں ہی سن سن کر لوگوں کے دل مردہ اور جی افسردہ ہوئے جاتے تھے *

تحمّل اور ہمّت کو جونہی ان کی صورت نظر آئی۔ دفعۃً غش کھا کر گر پڑے۔ اس جنگل کی ہوا میں عجب تاثیر تھی کہ بھلے چنگے آدمیوں کے جی چھوٹے جاتے تھے۔ اور حوصلے پست ہوئے جاتے تھے۔ سب کے ہتیار اور اوزار ہاتھوں سے چھوٹ پڑے۔ بہتیرا دلوں کو سنبھالتے تھے۔ مگر دل قابو میں نہ آتے تھے۔ اس حال کو دیکھ کر سب کی عقل جاتی رہی۔ اور پھرتے سرے سے اپنے حال پر افسوس کرنے لگے۔ کہ

ہائے **ملک فراغ** کو کیوں چھوڑا۔ اور خسرو آرام کی اطاعت سے کیوں منہ موڑا۔ آپس میں صلاح کی۔ کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ چلو پھر اپنے قدیمی بادشاہ خسرو آرام کی خدمت میں چل کر سلام کرو۔ اور باقی زندگی جس طرح ہو۔ اس کی اطاعت میں بسر کر دو ٭

جو آسائش کے قدرتی سامان تھے وہ اپنے ہاتھوں کھوئے

اب محنت کے بنائے ہوئے سامانوں سے آرام چاہتے ہو؟ یہ کہاں ہوگا

خسرو آرام بھی دنیا کے پردہ پر سے اٹھ نہ گیا تھا۔ ایک پل میں اس کے پاس جا پہنچے۔ عذر تقصیر میں عرض کیا کہ جو کچھ ہم نے محنت کی مدد سے حاصل کیا ہے وہ سب نذر ہے۔ ہمیں حضور اطاعت میں قبول فرمائیں۔ یہاں خسرو آرام نے بھی اب دربار کا آئین کچھ اور کر دیا تھا۔ تکلف۔ آرایش۔ بناؤ سنگار۔ عیش۔ آرام بہت سے لوگ رکن دربار ہو گئے تھے۔ قدرتی سبزہ زار اور خدائی مرغزاروں کو چھوڑ کر محلوں میں جا بیٹھا تھا۔ بالاخانوں اور دیوانخانوں میں رہتا تھا۔ خانہ باغوں کی روشوں پر گلگشت کرتا تھا۔ جاڑوں میں نرم نرم بستر اور گرم گرم مکانوں میں سوتا تھا۔ گرمیوں میں تکلف کے تہ خانوں میں بیٹھتا۔ اور بناوٹ کے فوارے سامنے چھٹا کرتے۔ باوجود اس کے کوئی نعمت مزا نہ دیتی تھی۔ اور کوئی غذا انگ نہ لگتی تھی۔ سب کچھ موجود تھا۔ مگر خاطر خواہ خوشی ایک بات سے بھی حاصل نہ ہوتی تھی۔ غرض **ملک فراغ** میں جو اس کے انتظام اور آزادی کا لطف تھا۔ وہ نہ رہا تھا کیونکہ سلطان **محنت پسند** کے زیر حکم رہ کر لوگ خالی بیٹھنے سے بھی گھبراتے تھے۔ اور جسے خوشحالی اور فارغ البالی کہتے ہیں۔ وہ کسی طرح نہ حاصل ہوتی تھی ٭

آرام کے بندو! دیکھو۔ بہت آرام بہت سی خرابیاں پیدا کرتا ہے

آرام شاہ کے وزیر اعظم **عیش** اور **نشاط** نام دو شخص ہوئے تھے۔ مگر عیش نے دغا کی۔ کیونکہ **مرض** ایک بڑا غنیم سلطنت کا تھا۔ وہ مدت سے **ملک آرام** کے درپے تھا۔ چنانچہ مرض نے عیش سے سازش کی۔ اور ایک رات یکایک قلعۂ جسم پر کمند

تم کہو - اسی وقت جلاوطن کر دوں - چنانچہ مشورہ وغیرہ مشیروں کی صلاح سے راحت - تکلف - بناؤ - سنگار وغیرہ سب نکالے گئے - ایک دن رسم شادی کہ وہ بھی سیدھی سادی تھی سرانجام ہوگئی - اور دونو سرکاروں کا انتظام ایک ہوگیا ٭

جب آرام اور محنت دونو اعتدال سے ہوں - تو کیوں صحت حاصل نہ ہو

اتفاق کو خدا نے بڑی برکت دی ہے - چند روز کے بعد خسرو آرام کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا - جس کا نام صحت شاہ رکھا گیا - بڑی خوشیاں ہوئیں - دونو طرف رسوم مبارکبادی کی ادا ہوئیں - گنہگاران سلطنت یعنی نشاط اور عیش کی خطائیں بھی اس خداداد خوشی کے شکرانہ میں معاف ہوئیں - مگر اس شرط پر کہ بے طلب سامنے نہ آنے پائیں - نہ بے تقریب بلائے جائیں - غرض صحت شہزادہ بی بی سلامت خاتون کا دود پیتا تھا - خواجہ پرہیز اُسے پرورش کرتے تھے - انہی کی تعلیم وتربیت میں بڑا ہوا - چونکہ دو گھروں میں ایک چراغ تھا - خسرو آرام اور سلطان محنت پسند دونو آنکھوں کا نور سمجھتے تھے - صحت شہزادہ بھی دونو بزرگوں کی برابر اطاعت اور دونو سلطنتوں کی برابر رعایت رکھتا تھا - اتفاق کی برکت سے خدا نے دونو گھر روشن اور سلطنت آباد کی - اور خدا کے بندوں کو بھی آئے دن کی مصیبتوں سے نجات دی ٭

سچ اور جھوٹ کا رزمنامہ

عہدِ قدیم کے مؤرخ لکھتے ہیں - کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لئے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے - شہسواری - تیر اندازی اور راست بازی - شہسواری اور تیر اندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی - مگر کیا اچھی بات ہوتی - اگر ہمیں معلوم ہوجاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے

سکھاتے تھے۔ اور وہ کونسی سپر تھی۔ کہ جب دروغ دیوزاد آکر ان کے دلوں پر شیشۂ جادو مارتا تھا۔ تو یہ اس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بڑی جگہ ہے! چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہوجاتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے۔ ناچار مکرنا پڑتا ہے۔ کبھی ابلہ فریبی کرکے جاہلوں کو پھنساتا ہے۔ جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے۔ اور جزوی جزوی خطائیں ہوجاتی ہیں۔ جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہونگے۔ جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے رستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لئے سننے والے بھی ضرور ہیں۔ کیونکہ خوشامد جس کی دوکان میں آج موتی برس رہے ہیں۔ اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا۔ اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار امید کا بھوکا آقا کو خوش کرکے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبت کا بندہ ہے۔ اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں نہ ڈرپوک ہیں۔ انہیں باتوں میں خوش کردینے ہی کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نودئے گدہوں کے دعوے بل ڈاگ[1] کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں۔ تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں کچھ امید۔ کچھ ڈر۔ کچھ مروت سے۔ غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عملداری دور دور تک پھیل گئی ہے بلکہ

---

[1] ایک قسم کا شکاری کتا ہے۔ جسے ہندوستانی زبان میں کلاٹانک کہتے ہیں۔

جن صاحب تمیزوں کو قوتِ عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی۔ اور خود اس مُردار سے متنفر ہیں۔ وہ بھی اسی کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں ❖

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شے پر دل آتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی بُرا ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا اُس کا جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی۔ اس کا ذکر بھی نہیں سُنتے۔ اس کان سُنتے ہیں۔ اُس کان سے نکال دیتے ہیں ❖

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں۔ اور جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں۔ تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں ❖

واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی۔ جو کہ ملکۂ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکۂ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اوّل تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انہوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزتِ دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا۔ اور حکم ہوا کہ جاؤ اولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں مسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے۔ تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت

مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھکر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا۔ اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعویدار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے۔ تو چونکہ بزرگان آسمانی کو ان کی دشمنی کی بُنیاد ابتدا سے معلوم تھی۔ سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور و طاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے۔ اُٹھی۔ اور اپنے زور میں بھری ہوئی اُٹھی۔ اسی واسطے بلند اُٹھی۔ اکیلی آئی۔ اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح و اقبال نور کا غبار اُڑاتے آتے تھے۔ اور پیچھے پیچھے ادراک پری پرواز تھا مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے۔ شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی۔ اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقلال رکاب پکڑے تھا۔ اور جو قدم اُٹھتا تھا۔ دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا ؎

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سانگ بھرتا تھا۔ تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دُنیا کی ہوا و ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لئے تھیں اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا۔ اسی لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح اُن کے حُکم اُٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں۔ اور کام بھی اُلٹ پلٹ بے اوسان تھے کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتحیاب تو جلد ہوجاتا تھا۔ مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا و ہوس اس کے یار وفادار تھے۔ اور اگر کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے ؎

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونو کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔
اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لئے سر پر بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ بنتا تھا۔ لاف وگزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار۔ بائیں میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا۔ اور باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دُور دُور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا۔ مگر وہ بھی بادہوائی۔ اٹکل پچو بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھیرتا تھا۔ دمبدم جگہ بدلتا تھا۔ کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی۔ مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعب خداداد کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتحیاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک بیحیائی کی ڈھال منہ پر لے ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا۔ اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے ٭

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی مگر سانچ کو آنچ نہیں۔ زخم جلد بھر آتے تھے۔ اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے۔ مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا ٭

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھیروں۔ اس لئے دھوکہ بازی اور

شُبہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لئے ایک سڑک[1] تیار کرو مگر اس طرح کے اینچ پیچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ۔ کہ شاہراہِ صداقت جو خطِ مستقیم میں ہے اُس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اُس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اُسی رستے سے جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا۔ اور جدھر سے چاہتا تھا۔ پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اُس نے ساری دُنیا پر حملے کرنے شروع کر دئے۔ اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا۔ ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرمانروائی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا۔ تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی۔ سب اپنی کمریں اس میں جکڑ لیتے تھے۔ کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑینگے۔ مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کرکے ہٹتے تھے۔ پھر ادھر ملکہ نے مُنہ پھیرا۔ اُدھر باغی ہو گئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی تو سمجھی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہونگے۔ جو بات سُنینگے اُسے مانینگے۔ اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائیگی مگر یہاں دیکھا کہ گذارہ بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں۔ اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی۔ مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف سے ہٹی اور پھر بدعملی ہو گئی۔ کیونکہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا دشمن کے زیرِ علم جا موجود ہوتے تھے۔ ہرچند ملکہ صداقت زمانی ان باتوں

[1] جب جھوٹ کی قلعی کھلنے لگتی ہے تو جھوٹا آدمی ایسی باتیں پیش کرتا ہے جس سے لوگ شُبہ اور شک میں پڑ جائیں اور سمجھیں کہ ہو تو سکتا ہے۔ شاید جو یہ کہتا ہے وہی سچ ہو۔

سے کچھ دبتی نہ تھی کیونکہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا - مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلے پر دیکھتی تھی - اور اُس میں سوائے مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی تو گھٹتی تھی - اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی - جب سب طرح سے نا اُمید ہوئی تو غصہ ہوکر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ مجھے آپ اپنے پاس بُلا لیجئے - دُنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہوکر جن بلاؤں میں خوش ہیں - انہی میں رہا کریں - اپنے کئے کی سزا آپ پالینگے - سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھکر بہت خفا ہوا - مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دُنیا سے اُٹھا تو جہان اندھیر اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائیگا - چنانچہ اس خیال سے اُس کی عرض نامنظور کی - ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بد اصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے - اُسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کرکے ایک انجمن منعقد کی - اُس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے :-

(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرمانروائی دنیا میں ہردلعزیز نہیں ؟

(۲) کیا تدبیر ہے - جس سے اُس کے آئین حکومت کو جلد اہل عالم میں رسائی ہو - اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو ؟

کمیٹی میں یہ بات کُھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے - اور کارروائی میں تلخی ہے - صدر انجمن نے اتفاق رائے کرکے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعوؤں کا دُھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے - جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دُھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اُٹھانے پڑتے ہیں - کبھی ایسے فساد اُٹھ کھڑے

ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے - اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دوراندیشی اور صلاح وقت کے بغیر کام نہیں چلتا - پس اُسے چاہیئے کہ جس طرح ہو سکے اپنی سختی اور تلخی کی اصلاح کرے - جب تک یہ نہ ہوگا۔ لوگ اس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کرینگے - کیونکہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے برخلاف ہے - اول تو اس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اسکی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں - انہیں سوائے عیش و آرام کے دُنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی - دوسرے وہ خود بہرُوپیہ ہے - جو صورت سب کو بھائے - وہی رُوپ بھر لیتا ہے - اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے - غرض اہل انجمن نے صلاح کرکے ملکہ کا طرز لباس بدلنے کی تجویز کی - چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا جیساکہ جھوٹ پہنا کرتا تھا - اور وہ پہن کر لوگوں کو جُل دیا کرتا تھا - اُس جامہ کا مصلحت زمانہ نام ہوا - چنانچہ اس خلعت کو زیب بدن کرکے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی - جس ملک میں پہنچتی - اور آگے کو رستہ مانگتی ہوا ہوس حاکم وہاں کے اُسے دروغ شاہِ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نظر گذرانتے - ادھر اس کا دخل ہوا اُدھر ادراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا - جامے کے اُترتے ہی اُس کی اصلی روشنی اور ذاتی حسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا +

چنانچہ اب بھی وقت آگیا ہے یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کرکے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لئے مضر سمجھنے لگتے ہیں - اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے - جب تبدیل لباس کرکے وہاں جا پہنچتا ہے - تو وہ لفافہ اُتار کر پھینک دیتا ہے - پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے - کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے +

گلشنِ اُمّید کی بہار

اِنسان کی طبیعت کو خدا نے انواع و اقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں۔ مگر یہ زمین جس قدر تخمِ اُمّید کو پرورش کرتی ہے۔ اس کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی۔ اور اَور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کر اٹھتی ہیں۔ یا بمقتضائے سن خاص خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر اُمّید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالت موجودہ ہماری کچھ خوشحال یا بدحال بھی ہو سکتی ہے۔ اُسی وقت سے اُس کی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ اُمّید ایک رفیق ہمدم ہے کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے۔ دمبدم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینہ کو پھیلاتا ہے۔ خیالات کو وسعت دیتا ہے اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوشحالی کا باغ پیش نظر رکھتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدائی کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں۔ پھر بھی یہ جادو نگار مصوّر ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے۔ جسے دیکھکر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائیگی تو ساری ہوسیں پوری ہو جائینگی اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائیگا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اُمّید کا ہونا ہر حال میں ضرور ہے۔ مفلسی۔ بیماری۔ قید۔ مسافرت بہت سے دُنیا کے دُکھ درد ہیں کہ اُمّید نہ ہو۔ تو ہرگز نہ جھیلے جائیں۔ آسا جیئے نراسا مرے۔ یہ نعمت جو بظاہر ہر کس و ناکس میں عام ہو رہی ہے۔ وہ ضروری شے ہے کہ دُنیا کی بہتر سے بہتر حالت بھی ہم کو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے بہلاوے ہیں۔ اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے تو ایک دم

گذارنا مشکل ہو جاے۔ اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے ٥

پر اُمید وصل پر برسوں گوارا ہوگیا	ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار

اس میں بھی شک نہیں کہ اُمید دھوکے بہت دیتی ہے۔ اور ان باتوں کی توقع پیدا کرتی ہے جو انسان کو حاصل نہیں ہوسکتیں۔ مگر وہ دھوکے اصلی نعمتوں سے سوا مزا دیتے ہیں۔ اور موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملہ میں ناکام بھی کرتی ہے تو اسے ناکامی نہیں کہتی بلکہ قسمت کی دیر کہہ کر ایک اُس سے بھی اعلےٰ یقین سامنے حاضر کردیتی ہے میں ایک رات انہی خیالات میں حیران تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے اور زمانۂ آیندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لئے اُمید و بیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے۔ یکایک آنکھ لگ گئی۔ دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نو بہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ اُمید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔ تمام عالم رنگین شاداب ہے۔ ہر چمن رنگ روپ کی دُھوپ سے چمکتا۔ خوشبو سے مہکتا۔ ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمین فصل بہار کی طرح گلہاے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے۔ اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سرتا پا محو ہوگیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو اُن چمنہاے دلکشا کو نظر غور سے دیکھنے لگا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف[۱] زیادہ ہو۔ پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دُور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہیں آب زلال کے چشمے دُھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھُنڈ کے جھُنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز

[۱] دیکھو دُنیا میں جوں جوں انسان کامیاب ہوتا ہے اُس سے آگے کی کامیابیوں کی ہوس دل میں پیدا ہوتی جاتی ہے ٭

سے بولتے سُنائی دیتے تھے۔ یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں۔ اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں۔ مگر پھر یہاں سے جو نظر اُٹھائی تو اَور ہی طلسمات نظر آیا۔ یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں۔ اُن کے تیار میوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اس لطف نے اَور آگے بڑھنے کو للچایا۔ چنانچہ قدم اُٹھایا مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا۔ زیادہ حیران ہوتا گیا۔ کیونکہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی۔ پاس پہنچ کر اس کی رنگت[لہ] پھیکی پڑ گئی۔ اور میوے تو گر ہی چکے تھے۔ بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھیں وہ آگے آگے اُڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھُرتی سے پہنچا تھا۔ اور جو بہاریں تھیں۔ وہ بھی ہر قدم پر سامنے ہی تھیں۔ مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں[لہ]۔ گویا میرے شوقِ آرزو کو دہکاتی تھیں۔ کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا۔ وہ اَور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں ✤

اگرچہ بار بار خوش اور دمبدم غمگین ہوتے ہوتے میں دق ہو گیا تھا۔ مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا کہ چلے چلو۔ جو نعمتیں ڈہکا رہی ہیں۔ کبھی نہ کبھی ہاتھ بھی آئینگی۔ آخر چلتے چلتے ایک تماشا نظر آیا کہ جس میں زن و مرد خرد و کلاں بہت سے آدمی اُچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں۔ یا کسی نشاط عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک کے مُنہ پر یقین کا رنگ چمک رہا تھا۔ اور ایک ایک کی آنکھ سُرمۂ شوق سے روشن نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کی خوشی کچھ خاص قسم کی ہے کہ وہ اُسی کے دل میں ہے۔ سب ملے جُلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا۔ نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارا کرتا[سے] تھا۔ بہت لوگوں

لہ انسان کی طبیعت کا عجیب حال ہے۔ جو ہوس پوری ہو جاتی ہے وہ مزا نہیں دیتی۔ اس سے آگے کے لطف دل میں ارمان اور ذوق شوق پیدا کرتے ہیں ✤

لہ جوں جوں حصولِ مراد میں دیر لگتی ہے شوق زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اور امید بھی اس کے ملنے کے سامان سامنے دکھاتی جاتی ہے ✤

سے انسان جس مقصد کے لئے کوشش کرتا ہے۔ کسی سے کب کہتا ہے۔ اندر ہی اندر تدبیر کرتا ہے ✤

کی گرمی رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزومند شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو۔ تو انہیں اس کے بجھانے کی بھی فرصت نہیں[1]۔ اس واسطے اُن کے روکنے کو جی نہ چاہا۔ اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھا کیا۔ آخر ایک بڈھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے انھی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا مگر کچھ ہو نہ سکتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ بڈھے کو اب کیا ہوس ہوگی۔ اسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو۔ چنانچہ اسے سلام کیا۔ بڈھے نے تیوری میل کر منہ پھیر لیا اور کہا "صاحب دق نہ کیجئے۔ آپ جانتے بھی ہیں؟ جس وقت کی کہ ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے۔ وہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ایک عہد آیا ہے کہ تمام عالم فارغ البالی سے مالامال ہو جائیگا۔ افلاس زدہ اور طالب روزگار بیچارے ٹیکس اور محصولوں کے مارے آئے دن کی جانکنی سے خلاص ہو جائینگے۔ بلکہ فلک کے بے مرغ جو اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں۔ وہ بھی بازو ڈال کر آرام سے بیٹھ جائینگے۔" میں نے بڈھے کو اس کی خشکی دماغ کے حوالے کیا۔ اور وہیں ٹھیر گیا۔ اتنے میں ایک شخص سامنے آیا۔ جس کی ملامت شکل اور آہستگی رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید یہ کچھ اخلاق سے پیش آئے۔ مگر جب میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے جھک کر ایک سلام کیا۔ اور کہا "اگر آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا۔ مگر اب اس خوشی کا ہوش نہیں۔ کیونکہ ۲۰ برس سے میں ایک عہدے کی اُمیدواری کر رہا تھا۔ اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے۔" میں نے اسے بھی چھوڑا۔ اور ایک اور کو جا لیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کرے۔ کیونکہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دیکھا کہ بے تحاشا بھاگا چلا آتا تھا۔ اس نے ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی۔ اس کے دریائے منافع میں غوطہ مارا چاہتا تھا یعنی اگر کچھ اور نہ ہو۔ تو ایجاد کا انعام

[1] لئے عام کے آگے سی اور کا احتیاج کی اون پر ا ار آب لئے ہے۔ بعض کو جوانوں سے زیادہ ہوس [illegible]

ہی ہاتھ آجائے۔ ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے معلوم ہوا کہ وہ طول بلد اور عرض بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے۔ اور سرکارِ علم سے انعام کا اُمیدوار ہے۔
جب جابجا سے ٹکریں کھائیں تو سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بے حاصل ہے۔ اب جو اپنی آنکھ کہے وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو۔ اور آپ دیکھو۔ کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پروا سا نظر آیا۔ وہ آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے۔ اُسے دیکھکر دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے بھی ٹٹولنا چاہئے۔ چنانچہ معمولی سوال کا سبق اُسے بھی سُنایا۔ وہ ہنسا اور کہا "صاحب جہاں آپ کھڑے ہیں یہ ملکہ اُمّید کا باغ ہے۔ وہ ملکہ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا سامنے دیکھو۔ بہت سی پریاں خوشنما اور نفیس نفیس چیزیں لئے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زور شور مچاتے دیکھا، یہ انھی کے اشاروں پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں" آنکھ اٹھا کر دیکھوں تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوان عالیشان ہے اور اُس کے صدر میں ایک پری جس کا گلزارِ جوانی عین بہار پر ہے۔ سرِ تخت جلوہ گر ہے۔ مسکراہٹ اُس کے زیرِ لب پارہ کی طرح لوٹتی ہے۔ لعل و جواہر۔ تاج مرصع۔ موتیوں کے ہار۔ خلعت زرنگار کشتیوں میں چُنے ہوئے آگے دھرے ہیں۔ قسمت اور نصیب جہان کی نعمتیں سجائے۔ اس کے داہنے بائیں دست بستہ حاضر ہیں۔ اور بہار زندگی کے پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے۔ عیش مدام اور فرحت دوام سے چہرہ روشن ہے۔ اُس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ۔ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ میری ہی طرف متوجہ ہے۔ اور اسی بھروسے پر ہر ایک فخر اور ناز کے مارے پھولا نہیں سماتا۔ رستے کے دونو طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں پست اور بے حقیقت تھی مگر ہرے درختوں نے سایہ کیا ہوا۔ دیواریں لپی ہوئیں۔ دروازے پر روشن حرفوں میں لکھا تھا۔ "قناعت کا آرام گھر" بعضے تھکے ماندے ان میں چلے جاتے اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتے

رستے والے دیکھ دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گئے اور ہمت کے میدان ہار گئے ؞

باغِ اُمّید کے دو دروازے

یہ[۵] دیکھکر میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے ہر جگہ نظر پہنچ سکتی تھی۔ اور اس جگمھٹ کے بھی ایک ایک آدمی کا حال خوب خیال میں آتا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ باغِ اُمّید کے اندر جانے کے دو دروازے ہیں۔ ایک داروغۂ دانش کے اختیار میں ہے۔ دوسرا داروغۂ خیال کے تحت میں ہے۔ داروغۂ دانش ایک تندمزاج اور وسواسی شخص ہے کہ جب تک بہت سے سوال اور اُلٹی سیدھی حجتیں نہیں کر لیتا۔ تب تک قفل کی کنجی کو جنبش نہیں دیتا مگر داروغۂ خیال خلیق اور ملنسار شخص ہے۔ وہ اپنا دروازہ کھُلا ہی رکھتا ہے بلکہ جو اس کی حد میں جائے اُس سے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ پیش آتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ داروغۂ دانش کی حجتوں سے گھبراتے تھے یا جنہیں اُس نے جانے نہیں دیا تھا۔ ان لوگوں کی بھیڑ اُس کے دروازے پر لگ رہی تھی۔ داروغۂ دانش کے دروازے سے ملکہ کی تختگاہ خاص کو رستہ جاتا تھا مگر اس راہ کی زمین پھسلنی۔ سڑک پتھریلی۔ رستے ایسے اینچ پیچ کے تھے کہ کٹھن گھاٹی اسی کو کہتے ہیں۔ جب کسی قسمت والے کو داروغہ سے اجازت مِل جاتی تھی۔ تو اس کٹھن گھاٹی میں دُکھ بھرنے پڑتے تھے۔ اگرچہ چڑھنے والے پہلے سے بھی رستے کے اینچ پیچ اچھّی طرح جانچ لیتے تھے۔ اور جو جو بچاؤ کے مقام تھے ان میں قدم قدم پر نشان کر لیتے تھے۔ مگر پھر بھی اکثر ایسی مشکلیں پیش آتی تھیں۔ جن کا سان گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ جہاں صاف سیدھا رستہ سمجھے ہوئے تھے وہاں کچھ ایسا تہلکہ پیش آتا تھا کہ یکایک تھم جانا پڑتا تھا۔ ہزاروں اُلجھاوں میں اُلجھتے

---

[۵] یہ باتیں ہم پر روز گزرتی ہیں۔ مگر کوئی خیال نہیں کرتا۔ دیکھو! یہاں نہیں کس خوبصورتی سے رنگ دیگر بیان کیا ہے۔ عقل جب تک سب تدبیروں اور تجویزوں کے پورے پورے بندوبست نہیں کر لیتی تب تک کسی اُمّید پر کوشش کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہم و گمان کے بندے ذرا سا سہارا دیکھتے ہیں۔ اور اُٹھ دوڑتے ہیں۔ وہیں ٹکراتے ہیں۔ اور ناکام ہوتے ہیں ؞

تھے - صدہا رپٹنوں میں رپٹتے تھے - بہتیرے ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے تھے - اکثر خس پوش گڑھوں میں جا پڑتے تھے - غرض ایسی ایسی خطرناک واردتیں اور ناکامی کے صدمے تھے کہ بہت آدمی تو پہلے ہی دھاوے میں اُلٹے پھر آتے تھے - بہتیرے رستے میں غش کھا کر رہ جاتے تھے - بعض بعض ایسے بھی تھے کہ اُن کی استقلال سے راہ تھی - وہ اس کی دستگیری سے ملکہ کے ایوان تک جا پہنچتے تھے - ان میں اکثر ایسے ہوتے تھے جو صلہ کو دیکھکر پچھتاتے تھے - کہ ہائے ہماری محنت تو اس سے بہت زیادہ تھی - یہ تو کامیابی نہیں ہوئی - حق تلفی ہوئی ہے - باقی جو لوگ اخیر انعام لیکر پھرتے تھے - اُن کا انجام یہ ہوتا تھا - کہ دانائی داروغہ دانش کی بی بی - ملکہ کی مصاحب تھی - وہ اُن کا ہاتھ پکڑتی تھی - اس کی رہنمائی سے وہ لوگ گوشۂ قناعت میں جا بیٹھتے تھے ۔

اے راہ اُمید کے مسافرو! چونکہ داروغہ دانش کی حجتیں اور اُن کے رستہ کی مشکلیں مجھے بہت سخت معلوم ہوئیں اس لئے میں نے داروغہ خیالی کی طرف رُخ کیا - یہاں بارگاہ کی طرف جانے کو کوئی معمولی سڑک نظر نہ آئی مگر ملکہ صاف سامنے کھڑی تھی - وہ یہاں سے سرتاپا ساری نظر آتی تھی - اور اپنے عجائب غرائب نایاب اور بیش قیمت چیزوں پر سب کو برابر حسن طلب کے انداز دکھاتی تھی - پھر بھی لطف یہ تھا کہ ایک ایک دل کو اپنی ہوا میں جُدا جُدا انداز سے اُڑا رہی تھی جس سے ہر شخص یہ جانتا تھا - کہ جو نگاہ مجھ پر ہے وہ کسی پر نہیں - اور مجھ سے زیادہ کسی کو کامیابی کی اُمید نہیں - اسی واسطے بجائے خود کسی کا دماغ پایا نہ جاتا تھا - پہاڑ اس خیالی رستے کی طرف سے ایسا ڈھلوان تھا کہ قدم نہ ٹھہر سکتا تھا - کیونکہ وہمی باتوں میں پائداری کہاں ؟ باوجود اس کے آمد و رفت کے نشان بہت کثرت سے تھے - کیونکہ اس رستہ میں چلنے والے بہت ہیں - اس کی سڑک سایہ دار درختوں سے ایسی چھائی ہوئی تھی - کہ کسی کو جانا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا - ساتھ اس کے ہر شخص

یہ جانتا تھا کہ جو رتبہ میں نے پایا ہے۔ وہ کسی کو ہاتھ ہی نہیں آیا ٭

یہ بلا نصیب لوگ بہتیرے جتن کر رہے تھے۔ بعضے تو ایسے کلدار پر لگانے کی فکر میں تھے جن کی حرکت کبھی تھمے ہی نہیں۔ بعضے کہتے تھے" جو ہو سو ہو۔ انہی قدموں چلے جاؤ بلا سے مر جاؤ" یہ سب حکمتیں کرتے تھے۔ اس پر بھی زمین سے اُٹھ نہیں سکتے تھے۔ اور اُٹھے تو وہیں گر پڑے۔ مگر یہاں پڑے تھے تاک اُدھر ہی لگی تھی۔ اور اس حال تباہ پر خود پسندی کا یہ عالم تھا۔ کہ جو لوگ سامنے عقل کی کٹھن منزل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اُن پر پڑے پڑے ہنستے تھے ٭

اکثر خیال کے پیارے اور وہم کے بندے ایسے بھولے بھالے تھے۔ جنہوں نے اس باغ میں آکر اَوروں کی طرح چڑھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تھا۔ یوں ہی ایک جگہ پڑے رہے تھے۔ یہ مقام۔ کاہل گھاٹی کہلاتا تھا اور ایک سُن سان اور بے آزار موقع پر تھا۔ مگر ملکہ یہاں سے بھی سامنے تھی۔ یہ اسی یقین میں خوش پڑے تھے۔ کہ کوئی دم میں وہ خود یہاں آیا چاہتی ہیں۔ اگرچہ اَور لوگ ان وہمیوں کو احمق اور کاہل وجود سمجھتے تھے۔ مگر انہیں کچھ پروا بھی نہ تھی۔ بلکہ یہ غم غلط لوگ اسی دعوے میں خوش بیٹھے تھے کہ سب سے پہلے ہم پر نظر عنایت ہوگی ٭

انہی بے پرواؤں میں میں بھی پڑا پھرتا تھا۔ ان میں اتنا لطف پایا کہ اگر کوئی بات کرے تو اُس کا جواب دیتے تھے۔ اور اپنی باتوں سے بھی دل خوش کرتے تھے۔ اسی خیال میں یکایک نظر پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو دیو ڈراؤنی صورت بھیانک مورت اس گھاٹی میں چلے آتے ہیں۔ کہ اُن کی کسی کو خبر نہیں۔ ایک کو تو میں جانتا تھا کہ عمر ہے۔ مگر دوسرا افلاس تھا۔ ان کے دیکھتے ہی سارے باغ اور چمن آنکھوں میں خاک سیاہ ہو گئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ بس عیش و آرام کا خاتمہ ہو گیا۔ دلوں پر خوف وہراس چھا گیا۔ لوگ جو ڈر کے مارے چیخیں مار مار کر چلائے تو گویا عالم میں ایک کہرام مچ گیا۔ اسی سے میں بھی چونک پڑا۔ اور دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا ٭

سیرِ زندگی

ایک حکیم کا قول ہے کہ زندگی ایک میلہ ہے - اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں یہی اس کے تماشے ہیں - لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پھر پختہ سال انسان ہوئے - اُس سے بڑھکر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر[۱] وہی ہے - جب اس فقرہ پر غور کی - اور آدمی کی اَدلتی بدلتی حالت کا تصوّر کیا تو مجھے انواع و اقسام کے خیال گزرے - اوّل تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے - کہ ہر دم ادنےٰ ادنےٰ چیز کا محتاج ہے - پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے - کہ ابھی ایک چیز کا طلبگار ہوتا ہے - ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے اُس کا عاشق زار ہوتا ہے ؛

پھر غفلت ہے - کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے - لطف یہ ہے - کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا - میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعۃً درد و مصیبت کی فریاد - خوشی کے ولولے - ڈر کی چیخیں ہواؤں کے زور - پانی کے شور - ایسے اُٹھے کہ میں بے اختیار اُچھل پڑا[۲] ؛

اوّل تو دل بہت حیران ہوا - بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے تو

---

[۱] بہت سے گرم و سرد زمانے کے دیکھتا ہے - نشیب و فراز عالم کے طے کرتا ہے - بچپن سے لیکر ساری جوانی تجربوں میں گزارتا ہے - جب گھس پس کر بڈھا ہو لیتا ہے - تو ذرا آدمی بنتا ہے - اور اس قابل ہوتا ہے کہ جو سُنے یا دیکھے اسے کچھ سمجھ بھی سکے ؛ [۲] ابھی ایک طرف ناچ رنگ شادی و مبارکبادی ہے ابھی دوسری طرف سے رونے پیٹنے کی آواز آتی ہے - ابھی ایک گھر میں دولت و اقبال کا جوش و خروش ہے - ابھی ایک صدمہ ایسا پڑا ہے - کہ ساری خوشیاں مٹی ہو گئی ہیں - اُدھر آبادی ہے ادھر بربادی ہے ادھر ہوا ئے ترقی و جوش اقبال ہے ادھر ادبار کی آندھی - ابھی عمر کا جہاز صحیح سلامت بادِ مراد پر چلا جاتا ہے ابھی طوفان تلاطم میں غوطے کھا رہا ہے ؛

آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا۔ کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔ اور اس غل کا کیا سبب ہے؟ ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب جاتے کہاں ہو۔ دریائے حیات میں تیر رہے ہو۔ پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی۔ کہ جس میں کچھ کشتیوں[۱] کی کمزوری سے کچھ ملاحوں[۲] کی غفلت سے کچھ ان کی بیوقوفی سے لاکھوں بھائی بند غارت ہو گئے وہ نہر تو ہم اُتر آئے ہیں۔ اب مانجھدھار سمندر ہے اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے۔ کبھی گرداب ہے۔ کبھی موجوں کے تھپیڑے کھا[۳] رہے ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح[۴] بھی اس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کئے ہیں۔ جو رستے بتانے اور پار اُتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے۔ مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش جاتی ہے نہ ملاح کی۔ فقط خدا کی آس ہے اور بس ؎

	سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں		جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں

یہ سن کر میں نے غور سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا اور دل نے کہا کہ پہلے ذرا نظر اُٹھا کر تو دیکھ لو۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک نہر خوشنما گلزار کے بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہمراہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کی لہروں میں ظاہرا نہ کچھ زور تھا نہ شور تھا۔ مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا۔ وہ اُسے بلبلے[۵] کی طرح بہائے جاتی تھی۔ ان گلزاروں کا کچھ حال دیکھنا چاہو تو بالکل اندھیرا تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ کہاں[۶] سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی میں نے آنکھ

[۱] کمزور کشتیاں بچوں کے نازک جسم اور دھان پان سے بدن ہیں [۲] اس سے بچوں کے ماں باپ اور طبیب یا تیماردار مراد ہیں [۳] یہ جوانی کا عالم ہے اور دنیا کے حادثے ہیں جو کہ تلاش معاش اور راہ ترقی میں اسے پیش آتے ہیں [۴] یہ بڑے بڑے عالم فاضل ڈاکٹر پروفیسر مولوی پنڈت ہیں جو ہماری تعلیم میں مصروف ہیں [۵] فی الحقیقت دنیا کی ابتدا کس نے دیکھی ہے جو آیا۔ یہی چلتا ہوا کارخانہ دیکھا۔ اور چلتا ہی چھوڑ گیا۔ [۶] شعر

یہ چمن یوں ہی رہیگا اور ہزاروں جانور　　اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائینگے

کھولی تھی اپنے تئیں باغ ہی میں دیکھا تھا۔ داہیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ اپنی لہر بہر میں بہتا چلا جاتا تھا۔ اور دھندلائی[۱] چھائی ہوئی تھی کہ نہایت تیز نظر بھی کام نہ کرتی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں[۲] کی چٹانیں ہیں۔ اور جابجا گرداب پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں میں بادمراد کے مزے لیتے چلے جاتے تھے۔ اور جو بچارے پیچھے رہ گئے تھے ان پر قہقہے اڑاتے جاتے تھے[۳] مگر یہ بھی ہنستے ہنستے اُنہی گردابوں میں ڈوبتے جاتے تھے۔ دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا یہ غضب تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی مشکل سے سنبھل سکتا تھا۔ انہی میں ایسے لوگ بھی تھے۔ کہ ناواقفیت و نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں کو گردابوں[۴] میں ڈال دیتے تھے۔ اور موجوں کے تھپیڑے اُنہیں چٹانوں پر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا۔ اور کشتی کو اس کی ٹکر پر چڑھا لانے کا تو کیا ذکر ہے۔ اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ کر بھی دھارے کے سامنے سے چڑھ آئے۔ یا کاش کہ جہاں سے چلا تھا پھر وہیں[۵] آجائے۔ سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر روک تھام سے سنبھالے چلے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطر نہیں۔ اگر ہے تو اور ہمسفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے تھے۔ اور اپنی بد انجامی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خود اسی مصیبت میں مبتلا تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے۔ جب موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بد اعمالی جو پرسے پر ملائے[۶] برابر عالم ہوا میں اڑتی چلی جاتی تھیں وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھیں[۷]۔ ہر شخص خوش ہوتا تھا۔ اور دل میں اپنے تئیں

---

[۱] خدا کے معاملے غیب کے اندھیرے میں ہیں کس کی عقل انہیں دیکھ سکتی ہے [۲] انہیں دنیا کے مکروہات۔ جسمانی بیماریاں۔ دشمنوں کی برخلافیاں۔ اور اپنی بدپرہیزیاں اور بے اعتدالیاں سمجھو۔ [۳] یہ باقبال اور کامیاب لوگ ہیں جن کی دنیا میں بن آئی ہے۔ [۴] نادانوں اور جاہل دوستوں سے خدا بچائے۔ [۵] بھلا عمر رفتہ کب آسکتی ہے اور جوان یا بڈھا آدمی بچہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ [۶] افسوس دنیا کے مزے ہمیں کیسا اندھا کر دیتے ہیں کہ انجام کے مکروہات اور خوف و خطر کچھ معلوم ہی نہیں ہوتے ؂

مبارکباد دیتا تھا کہ الحمد للہ میری کشتی کو کچھ خطر نہیں ہے۔ جو گرداب اَوروں کو نگل گیا۔ میں اُس سے بچ جاؤنگا۔ اور جن چٹانوں نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا۔ میں انہیں بھی بے لاگ پھاند جاؤنگا۔ غفلت نے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا کہ ساتھ کے جہازوں کی تباہی بھی دیکھتے تھے مگر اُسی رستے چلے جاتے تھے اس پر بے پروائی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے تو چپو بھی ہاتھ سے رکھکر بھول جاتے تھے۔ پھر ناچار ہوکر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے ؛

یہ سُستی اور بے پروائی اُن کی کچھ اس لئے نہ تھی کہ ایسی زندگی سے بیزار ہو گئے تھے۔ کیونکہ جب ڈوبنے لگتے تھے تو سب چلاتے تھے۔ داد بیداد کرتے تھے۔ اور اپنے اپنے دوستوں کو چیخیں مار مار کر پکارتے تھے کہ برائے خدا کوئی آؤ۔ اور ہمیں سنبھالو۔ اور اکثر اخیر وقت میں لوگوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے کہ ہم تو اپنی حماقتوں کی بدولت ان حالتوں کو پہنچے تم بچے رہنا۔ چنانچہ ان کی اس ہمدردی اور محبت پرستی پر بہت سی تعریفیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر ذرا سی دیر میں پھر بھول جاتے تھے۔ نہ وہ آپ سمجھتے تھے نہ ان کی نصیحت پر کوئی اَور عمل کرتا تھا۔ اِدھر اُدھر جزیروں کے کناروں پر کشتیاں اور جہاز ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ بہت سے مسافروں[1] کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ بہتیرے نیم جان۔ بہتیرے ایسی بیکسی اور تکلیف کی حالتوں میں تڑپتے تھے کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ ایک دوسرے کو ان کی مصیبت دکھا کر عبرت دلاتا تھا۔ مگر اپنے دل پر ذرا اثر نہ لاتا تھا جس کشتی پر ہم سوار تھے حق یہ ہے کہ اس کے جوڑ[2] بند بھی دریائے حیات

[1] انہیں پرانی عمارتیں۔ بڑے بڑے خاندانوں اور سلطنتوں کے تذکرے۔ اور نامی گرامی لوگوں کی یادگاریں سمجھو۔ یا پرانی عمارتیں۔ قدیمی مقبرے اور پرانے قبرستان [2] یہی تمہارا جسم خاکی ہے۔ جسے تم اچھی اچھی غذائیں کھلاتے ہو۔ ورزشوں سے تیار کرتے ہو۔ نہلاتے دُھلاتے ہو۔ گرم سرد ہواؤں سے بچاتے ہو۔ اور جوں جوں بڈھے ہوتے ہو وہ ناطاقت ہوتا جاتا ہے ؛

کی موجوں کے صدمے اُٹھانے کے قابل نہ تھے۔ بلکہ رستے ہی میں ٹوٹتے نظر آتے تھے۔ اور سب ساتھیوں کو یقین تھا کہ کیسی ہی پھرتی کریں یا زور لگائیں ڈوبنے سے بچتے نہیں ؂

جب ان آفتوں کا باہم چرچا ہوا تو جو مستِ غفلت زندگی کے نشہ سے سرخوش بیٹھے تھے۔ وہ بھی غمگین ہو گئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے۔ اور بُزدلے نامردوں کو زندگی عذاب موت ہو گئی۔ بلکہ رنج و غم کے بعد جن جن باتوں کی اُمید ہوتی ہے۔ اُس سے بالکل مایوس ہو گئے۔ مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس آفت میں زیادہ خطر[۱] تھا وہی زیادہ تر بے پروا تھے۔ بلکہ سب کا جی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطر کا خیال دُور ہی دُور رہے۔ اور جو جانتے تھے کہ آگے ایسی مصیبتیں آئینگی جو اُٹھائی نہ جائینگی۔ وہ سامنے نگاہ بھر کے نہ دیکھتے تھے۔ اس وقت کے لئے کچھ نہ کچھ مشغلے نکال[۲] لیتے تھے۔ اُمید تو ہمیشہ اس رستہ میں ساتھ ہی رہتی تھی۔ اُس سے ہنس کھیل کر دل بہلاتے رہتے تھے ؂

جن لوگوں کی اُمید سے بہت راہ تھی۔ اُن سے اُس نے رفاقت کے بڑے بڑے وعدے کئے ہوئے تھے۔ مگر اُس میں اتنی سکت بھی نہ تھی جس کے سہارے سے بھاگ کر تو بچ جاتے۔ فقط اتنا وعدہ تھا کہ اَوروں سے کچھ پیچھے ڈوبو گے۔ اور یہ بھولے بھالے احمق اتنے ہی وعدہ پر راضی تھے۔ درحقیقت اُمید کی باتیں اُن سے مسخراپن کے طور پر تھیں کیونکہ جتنی ان کی کشتیاں پُرانی ہوتی جاتی تھیں اتنی ہی بے خبری کے عہد نامے تازے کرتی تھی۔ اور تعجب یہ ہے کہ جنہیں ڈوبنے کا یقین تھا۔ وہی کاروبار کے لئے زیادہ کمر کستے تھے ؂

---

[۱] دولتمند عیاش یا بڈھے زیادہ خطر کی حالت میں ہیں۔ مگر انہیں کو غفلت زیادہ ہوتی ہے بلکہ مرنے کی بات سُننے کو بھی جی نہیں چاہتا [۲] راگ رنگ قصّے کہانیاں کھیل کود کی باتوں میں ایسے لوگ دل بہلایا کرتے ہیں ؂

دریائے زندگی میں ایک بہت خوشنا جزیرہ نظر آیا۔ اس کے کنارہ پر دریا سے لگا ہوا ایک بلند منارہ تھا اس پر سونے کے حرفوں سے لکھا تھا۔ **بداعتدالیوں کا گلزار**"۔ جہاں تک جزیرہ کی حد تھی وہاں تک پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانیں بلند تھیں۔ اسی واسطے ایسے ہیبت ناک گرداب پڑتے تھے جہاں سے کشتی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ چٹانیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اور جتنی کھلی تھیں۔ نہایت سرسبز اور خوشنما تھیں۔ جوانانِ مرغزار یعنی ہرے بھرے درخت ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے جھوم رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں وہیں آرام اپنی پلنگڑی بچھائے لیٹا تھا اور خوشی میٹھے میٹھے سُروں میں پڑی ایک ترانہ لہرا رہی تھی۔ یہی مقام رہگذر عام کا تھا۔ اس لئے جو لوگ ادھر سے گزرتے تھے۔ یہاں کی سرسبزی ان کی آنکھوں کو ضرور طراوت دیتی تھی ؂

ادراک کا ناخدا اپنے ہاتھ پر دُوربین لگائے کھڑا تھا کہ مسافروں کو اسی سکرڑے رستہ سے نکال لے جاتا تھا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ وہ کشتی کھینے کے لئے اُن سے ڈانڈ مانگتا تھا۔ کہ صحیح سلامت یہاں سے نکال دے۔ یہ اس باغ سبز پر ایسے محو ہو رہے تھے۔ کہ جواب بھی نہ دیتے تھے[ا] خواہ وہ خفا ہو کر کہے۔ خواہ منتوں سے مانگے۔ تھوڑے ہی ہونگے جو اس کا کہنا بھی مانتے ہونگے۔ اور دیتے تھے تو اس شرط پر دیتے تھے۔ کہ ان سبزہ زاروں کے پاس سے ہو کر نکلنا کہ ذرا دیکھ کر ہی دل خوش کرلیں۔ اور عہد لے لو کہ پھر رستے بھر ہم کہیں نہ اٹکینگے نہ سمجھتے تھے کہ برتنا تو درکنار ان بلاؤں کے پاس کو نکلنا بھی غضب ہے۔ چُھوا اور مُوا ؂

میں نے دیکھا کہ آخر ادراک چابکدست ان کے تقاضوں اور منتوں سے

[ا] عمر رواں کا جہاز چلا جاتا ہے۔ دُنیا گذرگاہ عام ہے۔ راگ رنگ حسن و جمال عیش و نشاط کے یہاں جمگھٹ ہیں۔ دیکھنا! کہیں ان کے مزوں میں آکر کود نہ پڑنا۔ ایسی چوٹ کھاؤ گے۔ کہ ہسپتالوں تک جانے کے قابل بھی نہ رہو گے ؂ [۲] عقل و ادراک نہیں ہر وقت بے اعتدالیوں اور بدپرہیزیوں سے بچنے کو اشارے کرتے رہتے ہیں مگر ان بچاروں کی کون سنتا ہے ؂

دق ہوگیا اور جزیرۂ مذکور کی طرف لے چلا۔ اس جزیرہ نے کشتی کو اس طرح کھینچا جیسے مقناطیس[1] سوئی کو کھینچے۔ جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت پچتائے اور جتنا زور تھا سب لگا دیا لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلا۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جانیں گنوا بیٹھے۔ ہاں جن لوگوں پر ادراک چابکدست کی چالاکی تدبیر کارگر ہوئی وہ بچے۔ مگر بڑے دکھ اٹھا کر بچے۔ اور نکلے تو جس طرح پہلے چلے جاتے تھے اسی طرح پھر موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے تلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی۔ اور یہ بھی بادِ مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لئے جاتے تھے[2] آخر ادھر ان کے زور گھٹتے گئے۔ اُدھر کشتیِ حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔ خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ سب ڈوب گئے۔ مگر جو ڈوبتا تھا۔ اپنی کوتہ اندیشی پر بہت پچتاتا تھا اور اوروں کو نصیحت کرتا جاتا تھا کہ

ع من نہ کردم شما حذر بکنید۔ خبردار۔ کوئی جزیرۂ بے اعتدالی کے سامنے نہ آنا *

خدا کی قدرت کہ جو ایسی ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی مرمت کرتے تھے اُنکے کاریگر بھی وہیں موجود تھے[3]۔ بہت لوگوں کو اپنے کاریگروں پر بڑا بھروسا تھا اور بعض کشتیاں بھی ایسی تھیں کہ اُنہیں تھوڑا ہی صدمہ پہنچا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ جنھوں نے تھوڑا صدمہ اُٹھایا تھا وہ بھی کچھ بہت نہ جئے روز بروز مرض بڑھتا گیا۔ آخر ڈوب ہی گئے۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ بعض ضرب رسیدہ ایسے تھے کہ کاریگروں نے خود انکی مدد میں پہلو بچایا[4]۔ مگر بہتیرے کاریگر خود ضرب رسیدوں سے پہلے ڈوب گئے۔ کہ وہ خود اپنی آفتوں میں مبتلا تھے *

غرض سیرِ زندگی میں چالاک لوگوں نے بھی اگر پایا تو اتنا ہی پایا کہ یہ کچھ پیچھے

---

[1] یہاں سوئی اور مقناطیس کو نہ دیکھو اپنے اشتیاق اور رغبت کی بے اعتدالی پر خیال کرو * [2] بڈھوں کو زندگی بہت پیاری ہوتی ہے کیسے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں * [3] یہ کاریگر حکیم جی ہیں یا ڈاکٹر صاحب ہیں * [4] حکیموں نے کہا۔ سیانے کا علاج کرو اس نے کہا حکیم کا علاج کرو *

ڈوبے وہ پہلے ڈوبے۔ بہتیرے مسافر ایسے بھی تھے کہ لڑکپن سے جن ہمراہیوں
کے ساتھ ساتھ چلے آتے تھے۔ اُنہیں غوطے کھاتے دیکھتے جاتے تھے اور آگے
بڑھے جاتے تھے یعنی باد مخالف برابر غرق کئے جاتی تھی۔ نہ ان بچاروں کو محنتِ تدبیر
کرنی پڑتی تھی۔ نہ غم انتظار اُٹھانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خوشی کی ٹکر کھا کر بچ نکلے تھے
وہ بھی آہستہ آہستہ ضعیف ہی ہوتے گئے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں مار مار کر پانی سے
بہت لڑے مگر جو اَوروں پر پہلے گزری تھی وہ اُن پر پیچھے گزری۔ آخر معلوم ہوا
تو یہی ہوا کہ اُمید کو بھی کنارۂ کامیابی تک پہنچنا مشکل ہے یہ حالت دیکھکر میرا دل
ایسا زندگی سے بیزار ہوا کہ جی میں آیا آنکھیں بند کرکے اس دریا میں کود پڑوں۔
اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نورانی صورت سبز لباس پہنے سامنے کھڑا
ہے اور اپنے عصا سے اشارہ کرکے پاس بُلاتا ہے۔ میں نزدیک گیا تو اس نے
اپنا ہاتھ میرے مُنہ پر پھیرا۔ اور عصا اُٹھا کر سامنے اشارہ کیا خدا جانے دُوربینِ الٰہی
سے میری آنکھیں روشن کر دیں یا کُہر جو دُھواں دھار ہو رہی تھی اُسے اپنی برکت
سے اُڑا دیا۔ دیکھوں تو سبحان اللہ صبح سعادت کا وقت ہے۔ چمن لہلہے۔ مرغانِ
سحر کے چہچہے۔ پھُولوں پر شبنم صبا اور نسیم کم کم۔ جزیرے کے جزیرے میوؤں
سے جُھومتے اور پھُولوں سے لہلہاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سمندر کا پانی جگمگ
جگمگ لہریں مار رہا ہے۔ بڑے بڑے اُمرا۔ شرفا خلعت ہائے فاخرہ اور زرق
برق کے لباس پہنے پھُولوں کے طُرّے سر پر ہار گلے میں ڈالے اِدھر اُدھر
درختوں میں شعر پڑھتے پھرتے ہیں۔ کچھ فواروں کے نیچے حوض میں پاؤں لٹکائے
بیٹھے ہیں۔ کچھ پھُولوں کی کیاریوں میں بے تکلف لوٹتے ہیں اور گانا سُن رہے
ہیں۔ غرض کہ ہجوم بہار۔ اور رسیلی آوازوں کے ستاروں نے وہ جگھٹ کر رکھا
تھا کہ شور قیامت بھی آئے تو خبر نہ ہو۔ اس عالم کو دیکھکر میرا ساغرِ دل خوشی سے
چھلک گیا اور بے اختیار یہی جی چاہا کہ اگر باز کے پر ہاتھ آجائیں تو اُڑوں اور

اس باغ فرح بخش میں جا پڑوں۔ لیکن اس پیر بزرگ نے کہا کہ وہاں جانے کا
کوئی رستہ نہیں اِلّا دروازۂ موت کہ جس سے تم ڈرتے ہو۔ دیکھو وہ سرسبز اور
رنگین جزیرے جو سامنے نظر آتے ہیں۔ اور سمندر کی قالین پر گلکاری کر رہے
ہیں حقیقت میں اس سمندر سے بھی زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں تک تمہاری
نظر کام کر سکے بلکہ جہاں تک تمہارا خیال دوڑ سکے۔ اس سے بھی آگے تک لاانتہا
چلے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں اور صاحبدلوں کے گھر یہیں ہونگے۔
جن جن لذّتوں کو جی چاہے اور طبیعت کیفیت اُٹھائے سب یہاں موجود ہیں۔
ہر جزیرہ باغِ جنّت کا مکان ہے۔ کہ اپنے اپنے مکین کے لائق شان ہے۔
کیوں **آزاد** کیا یہ مقام اس لائق نہیں کہ جان تک بھی ہو تو دیجئے اور انہیں
لیجئے کیا اس زندگانی کو مُصیبت سمجھنا چاہیئے جس کی بدولت یہ نعمتیں حاصل
ہوتی ہیں؟ کیا موت سے ڈرنا چاہیئے؟ کیا ملک عدم کو خوش ہو کر نہ چلنا چاہیئے؟
جس کی بدولت ایسی ایسی نعمتیں حاصل ہوں۔ نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اور
سُنتے ہو! نہ سمجھنا کہ انسان جس کے لئے یہ بے زوال سامان ہیں۔ اسے یوں
ہی پیدا کر دیا ہے۔ دُنیا مقام امتحان ہے۔ ہم تم یہاں امتحان دینے آئے
ہیں۔ امتحان کا نام سُنتے ہی میں چونک پڑا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو کچھ نہ تھا۔

اِنسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دُنیا کی مصیبتیں ایک جگہ
لاکر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب
سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مُصیبت۔ اور پہلی مُصیبت کو غنیمت سمجھینگے۔
ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اَور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

کہ اگر ہم اپنی اپنی مُصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مُصیبت کو اچھا سمجھتا +

میں ان دونو خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیئے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آگئی - خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے - خلاصہ جس کا یہ ہے - کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب وتکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں - چنانچہ اس مطلب کے لئے ایک میدان - کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا تجویز ہوا - اور لوگ آنے شروع ہوئے - میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اُٹھا رہا تھا - دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے - لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اَور بھی بڑا ہو جاتا ہے - یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا +

ایک شخص سوکھا سہما - دُبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا - اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھُرتی سے پھر رہا تھا - اُس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا - جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی - وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا - جس کا دامن دامنِ قیامت سے بندھا ہوا تھا - اس پر دیوزادوں اور جناتوں کی تصویریں زردوزی کڑھی ہوئی تھیں - اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اُس پر نظر آتی تھیں - اُس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی - اور نام اُس کا وہم تھا - ہر شخص کا بوجھ بندھوا تا تھا - اور لدواتا تھا اور مقام مقررہ پر لے جاتا تھا - میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتا دیکھا - اور اُن مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا +

اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اُس نے ذرا میرا دل

بہلایا صورت بہلاوے کی یہ ہوئی۔ کہ دیکھتا ہوں ایک شخص پُرانے سے چکن کے چغہ میں ایک بھاری سی گٹھری۔ لیئے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی۔ تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اَور شخص دوڑا آتا تھا۔ بدن سے پسینا بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپا جاتا تھا۔ اُس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا۔ اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بُری تھی اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے ؎

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے ان کے سروں پر دودِ آہ کی گٹھریاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیر خیالی۔ اور نالوں کے نیزۂ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے اُن کے پھٹ جائینگے۔ لیکن تعجب یہ۔ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ کچھ جد وجہد سے سر ہلایا مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اسی طرح چلے گئے ؎

بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جُھرّیاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت کچھ کچھ موٹے موٹے ہونٹ۔ اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنہیں دیکھکر شرم آتی تھی۔ مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اُس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں۔ کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے۔ مگر خوشی خوشی اُٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے اور آدم زاد کے انبار رنج والم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مُصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع واقسام کے سقم اور امراض بھی تھے۔ جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہموں نے خواہ نخواہ انہیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا۔ جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں اُن سب کا

مجموعہ تھا۔ یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراض
نوجوانی ہاتھوں میں لئے آتے تھے۔ مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا۔
اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بداطواری[1] پڑی ہوئی نہ
دکھائی دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا۔ اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوسہائے نفسانی
اور ضعف جسمانی اور عیوب عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر
موقع نہ ہاتھ آئیگا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جاتے۔ اتنے میں ایک عیاش
کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اُٹھائے بے پرواہ چلا آتا ہے۔ اُس نے
بھی ایک گٹھری پھینک دی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض
اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔
میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکینگے۔ مگر وہ بجائے اس کے اپنی
شرم و حیا کو پھینک گئے۔

جب تمام بنی آدم اپنے اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اُتار چکے تو میاں
وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے۔ مجھے الگ کھڑا
دیکھکر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے۔ ان کو اپنی طرف
آتے دیکھکر میرے حواس اُڑ گئے۔ مگر انہوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا۔ مجھے
اپنا مُنہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے
بدن اور قد وقامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہو گیا۔ اور ایسا گھبرایا کہ
چہرہ کو نقاب کی طرح اُتار کر پھینک دیا۔ اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ
ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھکر اُتار پھینکا تھا۔
یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرہ

[1] مراد اس سے یہ ہے کہ اپنی بے وقوفی یا بداطواری کو کوئی بُرا نہیں سمجھتا اسی واسطے اسے
کسی نے نہیں پھینکا۔

کے برابر تھی ٭

ہم اس انبوہ پُر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک تاک کر دیکھ رہے تھے جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے۔ جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کر لیں۔ اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے۔ اور بڑی ثروت پھرت کے ساتھ اس انبار عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا۔ اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں ٭

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا درد قولنج سے جاں بلب تھا۔ اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لئے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے درد مذکور پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا۔ مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی داڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجئے اور اپنا لڑکا لیجئے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا ٭

ایک بچارا جہازی غلام تھا کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑے بسور رہا ہے ٭

غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے

اپنے کئے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لی تھی وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اسے چھوڑا تھا اب وہ دردِ جگر کا مارا لوٹ رہا تھا۔ اور اسی طرح برعکس۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی +

عورتیں بچاری اپنے اَدل بَدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا۔ مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی۔ مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دُبلے تھے۔ اس لئے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرہ کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھکر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں۔ وہ حقیقت میں ہمارے سہار کے بموجب ہوتی ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے +

مجھے اس بُڈھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوبصورت سجیلا جوان بن کر چلا۔ مگر شانہ میں ایک پتھری ہو گئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اُس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بچارا لکڑی ٹیکتا گرتا پڑتا چلا جاتا تھا کمر جھکی ہوئی گردن بیٹھی ہوئی تھی۔ کھوے سر سے اونچے نکل آئے تھے۔ اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں اُن کا غول گرد تھا۔ یہ اُنہیں دیکھتا تھا۔ اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کئے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف نہ گزر جانا چاہئے چنانچہ اسکی صورت حال

یہ ہے کہ بڑے چہرہ والے یار میرے چھوٹے چہرہ کو لے کر ایسے بدنما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا مگر میں ایسا بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی۔ اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بچارا میرے ہنسنے سے شرما گیا۔ مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی کیونکہ جب میں اپنی پیشانی سے عرق ندامت پونچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ہاتھ رکھنا کہیں تھا اور جا پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ جب چہرہ پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکر کھائی۔ میرے پاس ہی دو آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا۔ ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے مٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا! اس نے ایک لمٹنگو سے مبادلہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی ان دونو کو جو دیکھتا تھا وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو بلیوں پر چلا جاتا ہے! سر کا یہ عالم تھا گویا ہوا میں اُڑا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ کمال کوشش سے قدم اُٹھاتا تھا مگر یہ حال تھا کہ دونو طرف دو واٹرے کھنچے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت کی حالت غریب کو دیکھ کر کہا کہ میاں اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سوا دمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں ÷

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری۔ نالہ و فریاد۔ آہ و افسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو بیکس آدم زاد کے حال دردناک پر پھر رحم آیا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دیں۔ پہلے ہی بوجھ انہیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی اُن وبالوں کو سر و گردن سے اُتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انہیں دھوکے میں

ڈال رکھا تھا وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اُس کی جگہ ایک فرشتۂ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات و سکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوشنما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھایا اور رحمتِ الٰہی پر توکل کر کے نگاہ کو اُسی کی آس پر لگا دیا اس کا نام صبر و تحمّل تھا۔ ابھی وہ اس کوہ مصیبت کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا جو کوہ مذکور خود بخود سمٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثلث رہ گیا۔ پھر اُس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اُٹھا اُٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ۔ اور بردباری کے ساتھ اُٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اُس کا شکریہ کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبار لاانتہا میں سے اپنا بار مصیبت چُننا نہ پڑا ؞

عُلوم کی بدنصیبی

تمہید

تمام صاحب جوہر اور کُل اہل کمال ہمیشہ سے اُن نالائقوں اور غلط نُما باکمالوں کے ہاتھ سے نالاں ہیں۔ جو فلک کی سفلہ پروری یا قسمت کی یاوری سے ہولے مراد کے پیلوں میں بیٹھے ہیں۔ اور ترقیوں کے آسمان پر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اس معاملہ میں اہل علوم سے زیادہ کوئی واجب الرحم نہیں۔ صدیوں کے بعد تو کوئی صاحب صنعت پیدا ہوتا ہے پھر اگرچہ ہر شخص کے کام کی ترقی خاص و عام کی قدردانی پر منحصر ہے۔ لیکن بنیاد اُس کی حکام یا اہل دول کی بدولت قائم ہوتی ہے۔ اسی واسطے اس کی رونق بازار کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اور ان خرابیوں کا بیان کرنا حدِ قلم سے باہر ہے۔ اوّل تو اہل کمال ہمیشہ کم۔ اور بے کمال انبوہ در انبوہ ہیں۔

ان کی بھیڑ بھاڑ ایسی خاک اڑاتی ہے کہ ان کے کمال پر خاک پڑ جاتی ہے۔ ناچار دل شکستہ ہوکر بیٹھ رہتے ہیں۔ جو ثابت قدم رہتے ہیں۔ اُن کی بدنصیبی یہ کہ جن قدردانوں پر مدارِ کار ہے۔ کبھی کثرتِ کار سے۔ کبھی بے پروائی سے۔ غرض تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے شوق کو اُن لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں جو اس کام کے لائق نہیں۔ اس صورت میں اگر قسمت سے ہوا چلی اور خود بخود کسی کی گود میں ثمرِ مراد آپڑا تو آپڑا۔ نہیں تو ذلت۔ تباہی اور دربدری کے سوا کچھ حاصل نہیں ان ناگوار باتوں کو غلط نما باکمال گوارا کر لیتے ہیں۔ مگر اصل باکمال مرنے کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ناچار گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ سفارشیں اُٹھاتے ہیں۔ دربدر پھرتے ہیں۔ خوشامدیں کرتے ہیں غرض کہ اس رستہ کی منزلوں میں جو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ ایک افسانہ کے استعارہ میں بیان ہوتی ہیں :۔

آغازِ مطلب

علوم و فنون نے دیکھا کہ مدت گزر گئی۔ ہمارے مرید اور خدمت گزار فقط اپنی ارادت دلی سے انسان کے فائدوں کے لئے محنت کر رہے ہیں اور جس صدق دل سے جانفشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں اُس کا صلہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ جن بے لیاقتوں کو جوہرِ کمال سے کچھ واسطہ نہیں اور انسان کی نفع رسانی کی بھی کچھ پرواہ نہیں رکھتے وہ کامیابی اور عیش و عشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سُلطان آسمانی کے دربار میں عرضی کی۔ خلاصہ جس کا یہ کہ انصاف و عدالت کے بموجب تمام مریدانِ خدمت گزار کو بمقتضائے انصاف و عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں۔ دربار میں مشتری صدرِ اعلیٰ اور عطارد میر منشی۔ جب یہ عرضی پڑھی گئی تو جو جو خدمتیں اور ادائے خدمت میں مشقتیں تھیں سب جتائی اور دکھائی گئیں۔ اور حق تلفیوں کا دعوےٰ کیا گیا۔ معلوم

ہوا کہ فی الحقیقت عالم خاک میں علوم وفنون کی کوششوں اور کارگزاریوں کا شکریہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ اب وہ آئے دن کے دُکھ بھرتے بھرتے ایسے دق ہوگئے ہیں۔ کہ یقین ہے چند روز میں دُنیا کو چھوڑ کر عالم بالا کی طرف چلے آئیں۔ اور اگر وہ دُنیا میں نہ رہے تو حضرت انسان جنہوں نے یہ شوکت وشان بنائی ہے حیوانوں سے بدتر رہ جائینگے۔ پھل پُھلاری گھاس پات چرتے پھرینگے۔ جنگلوں کے جانور بن جائینگے اور جو اُن سے زیادہ وحشی ہونگے وہ انہیں پھاڑ کھائینگے۔ اس کے فیصلہ کے لئے عالم بالا میں کمیٹی ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو اراکین دربار کا رنگ ہوتا ہے وہی کُل دربار کا رنگ ہوتا ہے چنانچہ سب کا اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ ضرور کسی کو بھیجنا چاہئے۔ ملکہ کوکب جمال کی ایک بیٹی تھی کہ باپ اُس کا عالم خاکی سے تھا۔ مگر اُس کے نور جمال اور حسن کمال نے تمام عالم بالا کو روشن کر رکھا تھا۔ اور صداقت وحقیقت کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ اسے حضور سے ملکۂ علم افروز کا خطاب عطا ہوا اور عقل کا تاج سر پر رکھا گیا۔ جس میں آفتاب کی طرح فہم وادراک کی شعاعیں جگمگاتی تھیں۔ رفعت کا تخت پھولوں سے سجایا۔ اس پر ملکۂ موصوفہ کو جلوہ گر کرکے اس طرف روانہ کیا۔ آسمان نے تارے اُتارے اور زمین نے بجائے غبار کے نور اُڑایا۔ اُس نے بھی عالم میں آکر باپ کی طرف سے وہ شوکت وشان لیاقت کی دکھائی جس سے تمام بے لیاقت نتھرا گئے۔ اور ماں کی طرف سے وہ روشنی پھیلائی کہ خاک کا کُرہ نور کی قندیل ہوگیا۔ دن رات دربار جاری تھا۔ علوم کے مسائل اور اُنکی تصنیفات کے مقدمات پیش ہوتے تھے۔ استاد یعنی صداقت کی طرف سے متانت اور خاموشی مصاحبت میں آئی تھیں۔ چنانچہ علوم وفنون جن لوگوں کی سفارش کرتے تھے۔ وہ اُن ہی کے ذریعے سے آکر پیش ہوتے تھے +

عالم بالا کے لوگ علم کے عاشق تھے۔ سب اُس کی فرماں روائی دیکھ کر

بہت خوش ہوئے۔ جلوس دربار کے لئے ہر طرح کے سامان بھیجے اور بارگاہ شاہی نے عجب شان و شکوہ حاصل کی۔ جب دربار میں آکر بیٹھتی تو عدل و انصاف کھوٹے کھرے کے پرکھنے کو کھڑے رہتے۔ اُمید سامنے ناچا کرتی۔ قدردانی دست راست پر کھڑی رہتی اور سخاوت کے اشارہ کے بموجب ہر ایک کو انعام دیتی کہ قسمت کے ہاتھوں لوگوں تک پہنچ جاتے تھے +

ایک دن ملکۂ علم افروز اپنی رفعت کے تخت ہوادار پر سوار ہو کر ہوا کھانے نکلی۔ اتفاقاً ایک پہاڑ کی طرف گزر ہوا۔ کوہ مذکور پر جہالت ایسی چھائی ہوئی تھی۔ کہ دامن کوہ سے لے کر چوٹی تک تمام دھواں دھار سے گھُٹ رہا تھا اس کے قدم سے سیاہی کے دُھوئیں اڑ گئے اور تمام تاریکی برطرف ہو گئی۔ یہاں اگر چھاؤں بھی تھی۔ تو نہ بارش کی سیرابی سے بلکہ گھٹاؤ کے پسینے سے سیل رہی تھی[ا]۔ اب اُس نے اپنی سرسبزی کو ہرا کیا۔ کچھ پھول تھے روشنی بغیر ٹھٹھر رہے تھے۔ وہ بھی چمک کر رنگ نکال لائے۔ غرض ہر شئے کی طبیعت اپنی اصلیت پر آکر شگفتگی کے جوش سے کھل گئی۔ اور خوشبوؤں سے عالم مہک گیا +

روئے زمین پر بہار کا یہ عالم دیکھ کر سلطان آسمانی نے بھی حکم دیا کہ سامنے سے پردے اُٹھا دو۔ عالم بالا کے پاک نہادوں نے گلدستے ہاتھوں میں لے لئے اور خوش ہو کر پھول اُچھالنے لگے +

جب اس پہاڑ کو گلوں سے گلزار اور شادابی سے نو بہار دیکھا تو علم تعمیر وہاں آیا۔ اپنے کمال سے ایک محل عالی شان تیار کیا۔ بہار نے کوسوں تک گلزار لگایا۔ طرح طرح کے اوزار کام میں آئے۔ سڑکیں نکالیں۔ اُتار چڑھاؤ درست کئے۔ ریلیں جاری کیں۔ جا بجا فرودگاہیں اور اُن میں مہمان خانے اور آرام خانے بنائے

[ا] بند اور گھٹی ہوئی جگہ میں نہ نباتات بڑھتے ہیں نہ اُن کے پھول کھلتے ہیں نہ پھل لگتے ہیں۔ سورج کی روشنی اور چلتی ہوئی ہوا کو اس میں بڑا دخل ہے یہ نہ ہو تو سب ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں +

غرض عجائبات و غرائبات سے سجا کر ایسا طلسمات کر دیا کہ جس کے دیکھے سے آنکھوں کو طراوت اور خیالات کو بلندی و وسعت حاصل ہو۔ اور تصنیفات میں ایجاد اور مضمون آفرینی کے لئے سامان بہم پہنچیں۔ چنانچہ ملکہ نے یہیں سکونت اختیار کی قسمت نے آکر انعاموں کا دروازہ کھول دیا۔ صداقت جانچتی تھی اور عدل بے رو و رعایت دئے جاتا تھا۔ یہ دروازہ رات دن کھلا رہتا تھا۔ اُمید دروازہ پر بیٹھی رہتی تھی۔ اور جن کے لئے علوم و فنون سفارش کرتے تھے انہیں بلا لیتی تھی۔ تمام دربار کثرت خلائق سے بھرا رہتا تھا۔ اور ہر چند اکثر اشخاص ناکام بھی جاتے تھے مگر شکایت کوئی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ خود ملکہ کی آنکھ کسی سے غافل نہ تھی جو لوگ وہاں سے ناکام پھرتے تھے اُن کا نام نالائقوں کی فہرست میں درج ہو جاتا تھا پھر وہ عالم شہرت سے خارج ہو کر یا تو گمنامی کے گوشہ میں بیٹھ جاتے تھے۔ کہ کوئی انہیں پوچھتا نہ تھا۔ یا ہیچ و پوچ اور واہیات کاموں پر جھک پڑتے تھے۔ بعض ایسے بھی ہوتے تھے کہ محنت سے مدد لیتے تھے اور پھر اپنے نقص کی تکمیل میں کوشش کرتے تھے۔

اب اہل نظر غباری عینکیں لگا لیں کہ بے کمالوں کے دلوں کے

غبار آندھی ہو کر اُٹھتے ہیں۔ اُن کے اقبال کا دور آیا ہے

ناکاموں میں اکثر نااہل ایسے بھی تھے کہ نہ اپنی ناکامی پر شرمندہ ہوتے تھے۔ نہ شرمندگی کے گوشہ میں بیٹھتے تھے۔ چند روز کے بعد اُن کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ایک دن سب نے محل کو گھیر لیا اور باغ میں آکر بستر ڈال دئے۔ ہر چند ملکہ مذکور کا جوہر افلاکی تھا مگر باپ کی طرف سے پیوند خاکی تھا۔ اس لئے تجویز میں کچھ نہ کچھ چوک بھی ہوتی تھی اور اگرچہ اس خطا کی اصلاح بھی بہت جلد ہو جاتی تھی۔ مگر پھر بھی حریف جو تاک میں لگے ہوئے تھے انہیں کہیں نہ کہیں موقع گرفت کا ہاتھ لگ ہی گیا۔ چنانچہ اُنہوں نے کچھ اپنے۔ کچھ اپنے رفیقوں کے

گھروں میں کمیٹیاں شروع کردیں اور آپس ہی میں نالش اور اپیل کے سے ڈھنگ ڈال دئے۔ تمام عالم میں رفاہ عام اور اصلاح اصلاح کا نام کرکے فریاد مچادی جس سے جمعیت بے شمار اکٹھی ہوگئی۔ صبح و شام جمع ہوتے۔ لمبی لمبی تقریریں کرتے۔ مگر اُس میں مطلب کا نام نہیں۔ جھوٹ موٹ کی بکواسیں کرتے جنہیں دلیل سے کام نہیں۔ کوئی سرو قد بن کر رائے دیتا۔ کوئی شمشاد قد ہوکر رائے شامل کرتا۔ کوئی تائید کرتا۔ کوئی تسلیم کرتا۔ آپ ہی اتفاق رائے کرلیتے۔ آپ ہی واہ۔ واہ۔ واہ وا کرلیتے۔ اسی تودۂ طوفان کو لکھتے اور پروسیڈنگ (روئداد) نام رکھتے۔ جسے مشتہر کرکے بڑے فخر کیا کرتے ؀

ان ناکاموں کی اُمّید سے راہ تھی۔ اور بیحیائی ان کی بڑی خیر خواہ تھی چنانچہ وہ ہمیشہ ان کو ملکہ کے دربار کی طرف دھکیلتی رہتی تھی کہ چلو اور دوبارہ دعوےٰ پیش کرو۔ اگرچہ وہاں سے دھکے کھاتے تھے اور جب جاتے نکالے جاتے تھے۔ اس پر بھی اُمید کا یہ حال تھا کہ ان کی رفاقت چھوڑتی نہ تھی۔ اور بیحیائی برابر زور لگائے جاتی تھی۔ غرض ان اندرونی راہوں کے ساتھ اُنھوں نے ایک اور رستہ نکالا۔ یعنی خیال کیا کہ یہ جمعیت ہماری۔ جو اُمّید کی حمایت اور بیحیائی کی عنایت سے روز افزوں ہے اس کی کثرت ہمیں ضرور فتحیابی بخشیگی پس جس طرح ہوسکے اپنی بھیڑ بھاڑ کو بڑھانا چاہیئے ؀

جب پروردگار کسی بندۂ خاص کو عزّت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے بندوں کے کام اس کے سپرد کرتا ہے تو خواہ مخواہ کے خیر خواہ مشورت دینے کو بہت پیدا ہوجاتے ہیں۔ مگر دیکھو! ان کی باتوں میں آکر حقیقت اور واقعیت کو نہ بھول جانا چاہئے خیال کرکے سُنو یہ خیرخواہ کیسے کیسے ہوتے ہیں

اُدھر تو بے لیاقت اہل فساد نے یہ سامان بہم پہنچائے ادھر یہ قدرتی پیچ پڑا کہ ملکہ کو آسمان سے اُترے ہوئے مُدّت ہوئی تھی۔ عالم خاک میں آکر نبت اُس کی

پستی کی طرف زیادہ تر مائل ہونے لگی۔ اور عدل و انصاف کی نصیحتیں سب بھول گئی۔ یا تو صحبت اس کی علوم و فنون سے تھی یا غرور سے دوستی ہوگئی۔ آرام اور غفلت کو مصاحبت میں لیا۔ اور رفتہ رفتہ غرور سے ایسی رسم وراہ بڑھی کہ اس سے شادی ہوکر دو لڑکیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ ایک اُن میں سے خوشامد اور دوسری خام خیالی۔ خوشامد نے فیاضی سے فیض تعلیم پایا تھا اور خام خیالی نے قسمت سے ۔

غرور کے محل میں بی بی خود پسندی بھی تھیں۔ جن کا اس نے دود پیا تھا۔ دوسری دایہ خود رائی تھی اُس نے پالا تھا۔ ملکہ علم افروز نے یہ غضب کیا کہ ساری خُو بُو خاوند کی اختیار کرلی۔ رفتہ رفتہ خود رائی کی صلاح سے فیصلے اور خود پسندی کے دستخط سے احکام جاری ہونے لگے۔ صداقت نے جو جو سبق پڑھائے تھے۔ سب بھلا دئے۔ اور عدل تو بیکار ہی ہوگیا۔ جب ان مصاحبوں کے اختیار اور لڑکیوں کی محبت زیادہ ہوئی تو علوم کا زور بالکل گھٹ گیا۔ اس کے رفیق اور قدردان دربار سے بند ہوگئے۔ وہ بچارے بُجھے چراغوں کی طرح طاقوں میں پڑے رہتے۔ ملکہ کا مُنہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا۔ انجام اُس کا یہ ہوا کہ علوم و فنون کے خدمت گزار محنتیں کرکے راتوں کو صبح اور صبحوں کو رات کرتے برسوں کی دستکاریوں میں اپنے کمال ظاہر کرتے مگر صلہ کے نام خاک بھی نہ پاتے۔ البتہ ان میں بھی جو چالاک ہوتے اور خام خیالی اور خوشامد کی وساطت سے وہاں تک جا پہنچتے اُن کے لئے سب کچھ موجود تھا۔

جب ارکان سلطنت کی بے اعتدالیاں حد سے گزر جائیں تو اہل فساد کیوں نہ سر اُٹھائیں

جب دربار کا رنگ اس طرح بے رنگ ہوا۔ نہ علوم کے قدرداں وہاں رہے نہ فنون کے جوہر شناس۔ تو چرچے اُس کے جابجا پھیلے اور اُن نالائقوں کو بھی خبریں پہنچیں جن کی علوم سفارش نہ کرتے۔ چنانچہ یہ خبریں سُن سُن کر اُن کے

ہاں بڑی خوشیاں ہوتی تھیں - وہ ملکہ کے دل سے دشمن بدخواہ تھے - ان باتوں کو اُس کے زوال دولت کے آثار سمجھ کر اپنی کامیابی کی تدبیروں میں زیادہ تر سرگرم ہوئے اُدھر ملکہ کے دربار کا یہ حال تھا کہ اُمید خام خیالی کے آنے سے خوش تھی - ادھر بیحیائی اپنے یاروں کو خوشامد کے سپرد کرتی جاتی تھی - دشمن مخفی جو شیطانوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے ملکہ کو اُن کا خیال بھی نہ تھا ؎

حضرت انسان کا قاعدہ ہے - کہ جب اپنے اوج پر آتے ہیں
تو اصلیت کو بھول جاتے ہیں - اچھوں کو گھٹاتے ہیں بروں کو
بڑھاتے ہیں - ویسے ہی اپنے کئے کی سزا پاتے ہیں ؎

مقام افسوس یہ ہے کہ اب ملکہ کی شان شاہی نہ رہی - دکھاوے کی رسموں پر آگئی - زبانی خرچ بہت - باقی ندارد - مبالغے - استعارے - بلند پروازیاں لفاظیاں حد سے زیادہ مضمون و مدعا غائب - کتابیں جلدیں کی جلدیں - مطلب پڑھو - تو ایک حرف نہیں - یا تعریف اور خوشامد - یا بے لطف اور بے معنی عبارتیں - انجام یہ ہوا - کہ فقط اوپر اوپر کے توزک و احتشام تھے اندر کچھ نہ تھا - یا تو ہر عرضی فوراً سُنی جاتی تھی اور ہر بات پر خاطر خواہ توجہ ہوتی تھی یا باہر ایک ایوان بنوا کر اس کا نام منتظر خانہ رکھا گیا - کہ اُمیدوار وہاں جا کر حاضر ہوا کریں جن لوگوں کو بیحیائی خوشامد کے سپرد کرتی تھی - وہ بے روک اس گھر میں چلے جاتے تھے - کوئی مزاحم نہ ہوتا تھا - نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ رنگ برنگ کا آدمی دربار میں آکر بھر گیا - ملک ملک کے لوگ چلے آتے تھے - اور فقط حمایتیوں کے بھروسے پر اس جوش و خروش سے اظہار کمال اور امتحان دینے کو بڑھتے تھے کہ ایک پر ایک گرتا تھا ؎

جب دربار کا رنگ بگڑتا ہے تو غرضمندوں کے خیالات اس سے زیادہ بگڑ جاتے
ہیں مگر تم یہ خیال کرو کہ اس عالم میں غریب غرضمندوں پر کیا گزرتی ہے -

جو لوگ اس دربار عام میں شریک ہوتے تھے - وہ سمجھتے تھے کہ ہم ملکہ کی خدمت

میں پہنچ نہ لئے کیونکہ اُن کے لئے بڑا قوی وسیلہ تھا۔ یعنی خوشامد۔ خوشامد کے ہاں حقیقت اور واقعیت دونو کو دخل نہیں۔ مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہاں سے معاملہ قسمت پر جا پڑتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اندر کا دروازہ خام خیالی کے سپرد تھا اور وہ اپنے دل کی راجہ تھی جب چاہتی تھی کھول لیتی تھی۔ جب چاہتی تھی بند کر دیتی تھی۔ غرض کہ بدنصیب عرضی دار اپنی ساری عمر عزیز اس بدحالی میں برباد کرتے تھے۔ کہ کبھی آس کبھی بے آس۔ ابھی خوش ابھی اُداس۔ اس ایوان کے اندر وسواس داروغہ تھا اور اُمیدواروں کا یار بنا ہوا تھا وہ دمبدم آتا تھا اور ایسی ایسی باتیں کان میں پھونک جاتا تھا کہ جن کا پورا ہونا قیامت تک ممکن نہ ہو۔ اور اُمید کہتی تھی کہ ہاں ہاں۔ اب حسن قبول کا خلعت دلواتی ہوں +

ساتھ اس کے رشک ڈیوڑھی کا داروغہ تھا اس کے گھر میں رات دن آگ پڑی دہکتی تھی۔ یہ سب اُسی کی سپردگی میں تھے۔ اور باوجودیکہ اُس حالِ تباہ میں گرفتار تھے۔ مگر بدقسمتی یہ کہ اب بھی اتّفاق نہ کرتے تھے ایک ایک کو دیکھتے تھے اور جلے مرتے تھے۔ اور آپس میں لڑتے تھے۔ عمارت مذکور میں اندھیر چھایا تھا۔ دیواروں پر اُلّو بول رہے تھے۔ گرد بدنامی کی چمگادڑیں اُڑتی پھرتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں علم کی شعاعیں سوئیاں ہو کر چبھتی تھیں۔ اور پروں[ل] سے ایسی خرابی و خواری کی بوندیں جھاڑتی تھیں کہ جس پر گرتی تھیں داغ پڑ جاتا تھا +

حقداروں کا حق بھی کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے

مگر نہ اس قدر کہ طوفان نوح کا مقابلہ کر سکے

ہرچند جس شخص کے داغ لگتا تھا نیکنامی بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھی۔ مگر خدا جانے بڑھاپا تھا یا بیماری کا ضعف تھا کہ بہت آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ یہ

ل یہ بیہودہ بے کمال۔ اور نکتہ چین معترض ہیں۔ ہنرمندوں کے ہنر اُن کی آنکھوں میں چبھتے ہیں۔ اور خواہ مخواہ عیب لگا کر اُن کی تصنیفات کو خراب کرتے ہیں +

بیچاری ہر چند کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح اپنا رنگ پھیر کر اُس دھبّے کو چھپاوے۔ لیکن خرابی یہ تھی کہ اس کا رنگ بہت کچّا تھا۔ ذرا سا پانی لگنے سے یا دھوپ میں رہنے سے اُڑ جاتا تھا۔ کہ اُس سے دھبّے اور بھی روشن ہو جاتے تھے اور بدنامی کے داغ کبھی نہ مٹتے تھے۔ البتہ صداقت کے تخت کے نیچے ایک چشمہ جاری تھا۔ اُس کے پانی سے خوب دھوئے جاتے تھے مگر وہاں سے اس پانی کا آنا مشکل تھا۔ ہاں اگر لاتا تھا تو وقت ہی لاتا تھا[۵] ؀

طوفان بے تمیزی میں قدم رکھنے کو جگہ ملے تو بھی گوشہ گیری ہی بہتر ہے

چونکہ علوم کا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ اپنے معتقدوں کو اس طرح تباہی کی حالت میں دیکھیں اس لئے اکثروں کو لے لیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی تاک میں لگے رہتے تھے اور جب موقع پاتے کسی نہ کسی ڈھب سے ملکہ کی خلوت میں جا پہنچاتے تھے۔ ملکہ دیکھکر فقط ابرو کا اشارہ کر دیتی تھی۔ یعنی منتظر خانہ میں حاضر ہوں۔ وہاں کوئی ان کی سُنتا نہ تھا کیونکہ ان بچاروں کو نہ فقط رشک بلکہ وسواس بھی ستاتا تھا۔ بیحیائی ایک چیخ مار کر کہتی تھی کہ کیوں خواہ مخواہ گھُس آئے اور بدنامی کو اشارہ کرتی تھی کہ جاؤ داغ لگادو۔ اخباروں میں چھاپ دو۔ اشتہار دیدو۔ سارے جہان میں رسوا کردو۔ یہ بچارے گھبرا کر گرتے پڑتے بھاگتے تھے۔ کسی کی کتاب چھٹ پڑتی تھی۔ کسی کا عمامہ رہ جاتا تھا۔ مگر اکثر داغ بھی کھاتے تھے۔ جو جو داغ لگ جاتے تھے وہ نہایت مشکل سے دھوئے جاتے تھے۔ اور جن کے وہ داغ لگا ہوتا تھا لوگ دُور ہی سے تاڑ جاتے تھے کہ یہ ضرور کبھی نہ کبھی منتظر خانے کی ہوا کھا آئے ہیں ؀

غرض مند بچارے ہر طرح ادائے خدمت کو حاضر ہیں کاش کہ وہاں قبول ہو

باقی اُمیدوار اس مبارک گھڑی کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ کہ کب خام خیالی

---

[۵] زمانہ کہ ہنر کا دشمن ہے۔ کیسا ہی اندھیر مچاوے۔ مگر خود بخود ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہوجاتا ہے ؀

اندر آنے کو اشارہ کرے۔ اور کب ہم حضور میں باریاب ہوں۔ یہ غرض مند بچارے احتیاج کے مارے اُسے خوش بھی کرتے تھے۔ مگر نہ فصاحت اصلی۔ یا اشعار واقعی یا خیالات عالی سے۔ بلکہ برخلاف اس کے جھوٹی داستانیں عاشقانہ افسانے۔ زٹلیات ڈھکوسلے۔ کہ ان میں ملکہ کی بھی تعریف ہوتی تھی۔ اور اس کے شوہر یعنی غرور کی بھی خوشامد ہوتی تھی۔ غضب یہ تھا کہ وہاں یہ بھی ایک آدھ ہی دفعہ سُنی جاتی تھی۔ کچھ تو خوش طبعی چٹکیوں میں اُڑا دیتی تھی۔ کچھ بد دماغی کی چین جبیں میں چلے جاتے تھے۔ بعض اشخاص خام خیالی کی بدولت دربار تک پہنچ بھی گئے۔ اور ملکہ نے قسمت سے انعام بھی ایسے ایسے دلوائے جن کی انہیں خود بھی اُمید نہ تھی۔ مگر تخت کے پا انداز میں کچھ سونے کی زنجیریں پڑی تھیں۔ جھٹ گلے میں ڈالیں۔ اور وہیں باندھ دیا کہ ہردم زیر نظر رہو۔ مگر اشاروں پر کام کرو۔ اور اسی طرح زندگی بسر کر دو۔ لطف یہ تھا کہ لوگ اُن زنجیروں کو پہن کر فخر کرتے تھے اور کیسے ہی نازیبا اور بے عزتی کے کام لے۔ بلکہ گالیاں بھی دے تو پیشانی پر بل نہ لاتے تھے اس پر بھی خام خیالی جب چاہتی تھی پکڑ لیتی تھی۔ اور زیور و لباس اُتار۔ پھر منتظر خانے میں دھکیل دیتی تھی ؛

یہ لوگ وہاں آکر پھر طوفان بے تمیزی کی بھیڑ میں مل جاتے تھے۔ ہاں بعض اشخاص جنہیں تجربہ کی نصیحت نے کچھ اثر کیا تھا۔ وہ تو کسی اور رستے سے ہو کر نکل گئے اور کوئی اَور خوشحالی کی راہ ڈھونڈ لی۔ باقی وہیں پڑے رہے۔ عمر گزارا کئے۔ اور خوشامد کے ذریعے سے خام خیالی کو خوش کرتے رہے۔ اتنے میں ایک اَور بھیڑ کا ریلا آ گیا۔ چنانچہ جب جگہ نے تنگی کی تو گرد مکان مذکور کے بہت سے کمرے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو حیثیت کے بموجب بیماری۔ کاہلی سُستی۔ شرمندگی مفلسی۔ مایوسی کے کمروں میں ڈال دیا۔ کہ وہاں وعدے۔ اور وعدہ شکنی۔ خوشی اور ناخوشی۔ اُمید اور نا اُمیدی

میں زندگی کے دن پورے کرتے رہیں - اور آخر ملکِ عدم کو چلے جائیں ؛
دیکھو صبح کے رستہ بھولے ہوئے شام کو گھر آتے ہیں -

علوم و فنون نے بھی بہت سے دھکّے کھا کر معلوم کیا کہ اب اس جہان میں رہنا عزّت نہیں - بلکہ بے عزّتی ہے - ملکہ کے محل سے نکلے - تمام دنیا میں بھرے تکلیف و مصیبت کے سوا کچھ نہ پایا - اتفاقاً ایک سبزہ زار میں گزر ہوا - ایک بہتے چشمہ کے کنارے پر کچھ چھوٹے چھوٹے مکان - اور کئی جھونپڑیاں نظر آئیں - معلوم ہوا کہ **آزادی** کی آرام گاہ یہی ہے - وہ **تحمل** کی بیٹی تھی اور **قناعت** کی گود میں پلی تھی - چنانچہ سب سے الگ اس گوشۂ عافیت میں پڑی رہتی تھی - اور **کنج عافیت** اُس کا نام رکھا تھا - یہ مقام **علوم و فنون** کو بھی گذران کے قابل معلوم ہوا - وہاں جا کر دیکھا تو **دانائی** - **دور اندیشی** - **کفایت شعاری** بھی موجود ہیں - **علوم** نے چند روز تک ان کی صحبت کو غنیمت سمجھا اور **آزادی** کے دامن کے نیچے اپنی عزّت اور آسائش کو چھپا کر زندگی بسر کرنے لگے - اے اہل علم ! اب وہی زمانہ ہے - عزّت و آسائش چاہو تو اس طرح گزارہ کرو ؛

کیوں **آزاد** ! مجھے تو اُن لوگوں پر رشک آتا ہے جو شہرت کی ہوس یا انعاموں کی طمع پر خاک ڈال کر گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہیں - اور سب بلاؤں سے محفوظ ہیں - نہ انعام سے خوش نہ محرومی سے ناخوش - نہ تعریف کی تمنّا - نہ عیب چینی کی پروا - اے خدا دل آزاد دے اور حالت بے نیاز ؛

عِلمیّت اور ذکاوت[1] کے مقابلے

تمہید

جو لوگ علم و کمال کی مسندیں بچھا کر بیٹھے ہیں۔ اُن کی مختلف قسمیں ہیں۔ اوّل وہ اشخاص ہیں کہ جس طرح علم کتابی اور درس و تدریس میں طاق ہیں اُسی طرح حسن تقریر اور شوخی طبع میں برّاق ہیں۔ دوسرے وہ کہ ایک دفعہ کتابوں پر عبور کر گزرے ہیں۔ مگر پھر خالی ہڈّیاں سمجھ کر اُن کے درپے نہ ہوئے۔ ہاں ایجاد و اختراع پر مرتے ہیں۔ کبھی تقریر کرتے ہیں کبھی تحریر کرتے ہیں۔ مگر اپنے اپنے موقع پر یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ قلم سے موتی برستے ہیں۔ اور مُنہ سے پھُول جھڑتے ہیں۔ تیسرے ایسے بھی ہیں۔ کہ پیٹ کی الماری میں جہان کی کتابیں بھرے بیٹھے ہیں۔ لیکن تقریر کے میدان اور ایجاد کے موقع پر دیکھو تو فقط مٹّی کا ڈھیر ہیں۔ تعجّب یہ ہے کہ اخیر کے دونو باکمال ایک دوسرے پر حرف رکھتے ہیں بلکہ حریف کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان دونو کی ہمیشہ چوٹیں چلتی رہتی ہیں۔ اور مناظرے اور مباحثے جو آئے دن جاری رہتے ہیں۔ ان میں مختلف منزلیں پیش آتی ہیں کہ جن کے اُتار چڑھاؤ سے اور اپنی غلطیوں کے سبب سے بار بار رفتار کے ڈھنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ تعجّب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی طبیعتیں بھی مختلف ہیں۔ اسی واسطے دونو کے طرفداروں سے دو جتھے ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کے مباحثوں اور مقابلوں میں عجیب عجیب لطف دیکھنے میں آتے ہیں۔ جن کے نشیب و فراز کو نظر غور سے دیکھنا اقلیم علم کے سیّاحوں کے لئے ایک عجیب تماشا ہوتا ہے۔ یہ ایسا

---

[1] انگریزی میں وٹ اور لرننگ کا مباحثہ تھا۔ میں نے وٹ کے واسطے بہت خیال کیا کوئی لفظ نہ ملا۔ ناچار ذکاوت لکھ دیا۔ اس میں جو لفظی قباحت اور معنوی کوتاہی ہے۔ سو ظاہر ہے۔ مگر اور لفظ اتنا بھی نہ تھا۔ مجبور سب قباحتوں کو برداشت کیا۔ کیونکہ غرض مطلب کے سمجھانے سے ہے۔ جو صاحب اس سے بہتر لفظ پائیں تحریر فرمائیں ؀

ہے۔ جیسے تمہیں کسی گلزار ملک کی سیاحی کا شوق پیدا ہو۔ اور ادھر کے کسی مسافر کا ایک سفرنامہ مل جاے یا اُس سرزمین کا ایک نقشہ ہاتھ آجاے۔ کہ گھر بیٹھے وہ لطف حاصل ہوجاے۔ داستان مفصّلہ ذیل ان معرکوں کا ایک مرقع کھینچ کر دکھاتی ہے :۔

صورت معرکہ

کہتے ہیں کہ اقلیم خیال میں ایک وسیع ولایت تھی جس کا نام **ملکِ فصاحت** اور وہاں کے بادشاہ کا لقب **ملک الکلام** تھا۔ بادشاہ مذکور کے محلوں میں دو بیبیاں تھیں۔ ایک کا نام **فرحت بانو** اور دوسری کا نام **دانش خانون** تھا۔ **دانش خاتون** کا ایک بیٹا تھا۔ یہ سیدھا سادا شخص حسن متانت میں باپ کا خلف الرشید۔ اور تمکنت اور سنجیدگی میں ماں کی تصویر تھا۔ اُسے **علم** کہتے تھے۔ **فرحت بانو** کی بیٹی **ذکاوت** تھی کہ باپ کے سبب سے خوش بیانی میں اسم بامسمّٰے اور ماں کے اثر سے زندہ دلی۔ اور شگفتہ مزاجی میں گلاب کے تختہ کو شرمندہ کرتی تھی۔ چونکہ **فرحت بانو** اور **دانش خاتون** دونو سوکنیں تھیں دونو بچّوں نے بگاڑ کا دود پیا تھا۔ اور بگاڑ ہی میں پرورش پائی تھی یعنی ابتدا سے ایسی باتیں دل پر نقش ہوئی تھیں۔ کہ ایک ایک کو خاطر میں نہ لاتا تھا بلکہ ہر ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھا۔ باپ نے دیدۂ دور اندیش سے اُن کی نا اتفاقی کے نتیجے پہلے ہی دیکھ لئے تھے اس لئے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دل اپنایت کی گرمیٔ محبت سے ملائم ہوں۔ آخر صورت یہ نکالی کہ اپنی نظر محبّت کو دونو میں برابر تقسیم کردیا۔ مگر باپ کی شفقتِ منصفانہ نے کچھ اثر نہ کیا۔ کیونکہ ماؤں کی طرف کی عداوت دُور تک جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ اور بچپنے کے خیالات کے ساتھ مل کر آہستہ آہستہ بہت دُور تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ نئے نئے موقع جو پیش آتے تھے۔ اُن میں عداوت مذکور اور بھی پختہ ہوتی جاتی تھی۔ مگر

اس میں شک نہیں کہ دونو کے دونو خوبی و کمال کی جان اور تعلیم و تہذیب کے پُتلے تھے ÷

جب ذرا ہوش سنبھالا تو عالم بالا کے پاک نہادوں کی نظر اُن پر پڑنے لگی۔ اور وہاں کی مہمانیوں میں آنے جانے لگے۔ چند روز کے بعد **ذکاوت** نے باپ کے اشارے سے اپنے **نشاط محل** میں بڑے بڑے اہل کمال کو جمع کر کے **رقاص فلک** یعنی زہرہ کی ضیافتیں کرنی شروع کیں۔ مگر ان جلسوں میں علم کا سانگ بھرا اور اس میں اس خوبی سے اس کی ہجو کی کہ محفل کو لٹا لٹا دیا۔ علم نے بہت بُرا مانا چنانچہ اُس کے توڑ پر **قاضی افلاک** یعنی **مشتری** کی ضیافت کی۔ اور اپنے زور علم سے شہزادی **ذکاوت** کی بے اصل سخن سازی اور بے علم طرّاریوں کی قلعی کھولنی شروع کی۔ اور **مشتری** نے **عطارد** کے اتفاق رائے سے عمامۂ فضیلت اُس کے سر پر بندھوا دیا۔ اسے تدبیر اور تقدیر کا انقلاب کہتے ہیں۔ کہ ماں باپ نے جن لوگوں کو مؤید سمجھکر فہمائش اور اصلاح کے لئے کہا تھا وہی چمکانے لگے۔ اور نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ عداوت کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ اسی عالم میں دونو بڑے ہوئے اور اب انہیں عالم قدس کے دربار میں جانے کا شوق پیدا ہوا۔ مگر وہ بھی اس[۱] لئے نہ تھا کہ خود کچھ عزت و حرمت حاصل کریں۔ بلکہ ہر ایک کی غرض یہ تھی کہ اپنے حریف کی عزت کو خاک میں ملائے اور جو کچھ اپنے ڈھنگ میں اس نے زور پکڑا ہے اُسے آگے نہ بڑھنے دے۔ آخر کار دونو کے جمال و کمال کی بدولت وہ دن آ پہنچا کہ رسم و رواج کے بموجب دربار **آسمانی** میں پہنچے۔ اوّل **علم** نے تخت کے سامنے کھڑے ہو کر دونو ہاتھ

[۱] دیکھو! ہمارے بھائی بند جب آپس میں مباحثہ کرتے ہیں۔ یا لوگوں پر اپنا کمال ظاہر کرتے ہیں تو زیادہ تر حریف پر اعتراض کرتے ہیں۔ اور اُس کے خراب کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ تصنیف و تالیف دکھا کر اپنے کمال کی تقویت نہیں کرتے ÷

اُٹھائے۔ اور چند فقرے ثنائے الٰہی اور دعائے بادشاہی میں اُس حُسن تاثیر سے
ادا فرمائے کہ سب کی آنکھیں آسمان کو لگ گئیں اور سینہ ہائے گرم کے جوش سے
محفل میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ بعد اُس کے ذکاوت آگے بڑھی۔ زمین خدمت
کو بوسہ دیا مگر جب سر اُٹھایا تو چند شعر پڑھکر ایک تبسّم زیر لب کیا۔ کہ گویا ایک چمن
بھر زعفران لوگوں پر برسا دی۔ انعام یہ ہوا کہ دونو عالم بالا کے پاک نہادوں میں
داخل ہو گئے اور خواجہ خضر نے اپنے مبارک ہاتھ سے آبحیات کا جام بھر کر
دیا کہ جب تک آسمان پر چاند سورج کا چاندی سونا ہے۔ تمہارا سکّہ روے زمین
پر چلتا رہے دربار آسمانی میں قدیم سے ملنساری اور اخلاق کا انتظام تھا۔
افسوس یہ کہ اُس وقت سے اس میں خلل آگیا۔ کیونکہ دربار میں داخل ہو کر دونو
نوجوانوں کے دماغ بگڑے اور دل نمود اور افتخار کے جوش سے بھڑک اُٹھے۔
پھر اُس پر ساتھ والوں کی واہ واغضب تھی۔ کہ اُدھر اُسے بڑھاتے تھے۔
اِدھر اُسے چڑھاتے تھے۔ مگر ان حملوں کی بوچھاڑیں دونو کے جی چھڑوائے
دیتی تھیں۔ جن کا تار نہ ٹوٹتا تھا اور فتح کا یہ حال تھا۔ کہ ادل بدل کرتی تھی۔
کبھی اُدھر کا پلہ جھکا دیتی تھی۔ کبھی اِدھر کا۔ ایک بالکل مغلوب نہ ہوجاتا تھا کہ
دو ٹوک ہو کر فیصلہ ہو جائے۔ جس وقت کہ بحث شروع ہوتی تھی تو ذکاوت اس
زرق برق اور طمطراق سے آتی تھی کہ سب کو اُسی کی جیت نظر آتی تھی۔ بلبل
کی طرح چہکتی۔ اور پھولوں کی طرح مہکتی۔ پہلے ہی حملے میں تمام محفل مارے خوشی
کے اس طرح چمک اُٹھتی تھی گویا کبھی نہ بجھیگی۔ اور علم روکھی پھیکی صورت بنائے
اپنے زور کو ذرا دبائے رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ تعریفوں کا جوش وخروش بگولے
کی طرح گذر جاتا۔ مگر اس کے بعد جو ٹھیراؤ شروع ہوتا وہی علم کی طرف سے
پکارتا تھا کہ اب ذرا ٹھیرو گے تو خاطر جمع سے سُنو گے۔ پھر علم بھی دفیعے
شروع کرتا۔ یہ عالمانہ دفیعے روکھے سوکھے تو ہوتے تھے۔ مگر اُن میں یا تو حریف

کے اعتراضوں کو آپس میں لڑا کر اُس کی باتوں سے اُسی کو جھوٹا کر دیتے تھے۔ یا یہ ذہن نشین کر دیتے تھے کہ ذکاوت کے دلائل اصلاً قابل وقار و اعتبار نہیں یعنی اُس نے سارے مقدمہ کے مطلب کو تو لیا ہی نہیں۔ ایک ایک ٹکڑا توڑ کر اُس پر باتوں کا طومار باندھ دیا ہے۔ اس تقریر کو سُن کر سب آپس میں تصدیق وتسلیم کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مگر پھر جبکہ ذکاوت کی رسیلی آواز نکلتی تو سب کے کان اُدھر ہی لگ جاتے۔ شور و غل چپ چاپ اور ساری محفل ایسی خاموش ہوتی کہ سنّاٹے کا عالم ہو جاتا۔ اس میں بھی جہاں جہاں موقع پاتی حریفانہ لطیفوں اور ظریفانہ چٹکلوں سے علم کو ایسا چٹکیوں میں اُڑا جاتی کہ سُننے والوں کے مُنہ میں تحسین و آفرین کا ایک حرف نہ چھوڑتی پھر ادھر سے علم اپنے ہدایت نامہ کا طومار لے کر کھڑا ہوتا۔ اوّل تو ذکاوت کا اور اُس کے کلام کا سفلہ پن دکھاتا کہ یہ متانت سے خالی ہے۔ جو جو رنگ اُس نے جمائے تھے انہیں حقیقی اور تحقیقی دلیلوں سے بلکہ آیتوں اور روایتوں سے اس طرح مٹاتا کہ اہل نظر کو سوائے سر ہلانے اور بجا و برحق کہنے کے کچھ بن نہ آتی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اہل محفل نے اپنی غلط فہمی کو چھوڑنا شروع کیا اور جب محفل کا خاتمہ کر کے اُٹھے تو علم کے دلائل صادقہ کے لئے عظمت دلوں میں لئے اُٹھے۔ مگر جتنی اُس کی عظمت لئے اُٹھے اتنی ہی اس کی شوخی و شگفتہ بیانی کے لئے مہر و محبّت لئے اُٹھے ؀

جب دونو کے کمال اپنی اپنی اعزاز و قدردانی کے لئے اہل نظر سے سفارش کرتے تھے تو حسن طلب کے انداز بالکل الگ الگ تھے ذکاوت تیز اور بے باک ہو کر ایسی چمک دمک سے آتی تھی۔ کہ دیکھنے والوں کی آنکھ نہ ٹھیرتی تھی۔ علم بھی آگے بڑھتا تھا۔ مگر اپنے وقار و متانت میں کمال بندوبست اور نہایت روک تھام سے قدم اُٹھاتا تھا۔ ذکاوت کند ذہنی اور دیر فہمی کے

داغ سے بہت بچتی تھی اور علم چوک جانے اور دھوکا کھانے کے سوا کسی تہمت سے نہیں ڈرتا تھا۔ ذکاوت کی طرّاری کا یہ عالم تھا کہ سمجھنے سے پہلے ہی جواب دے اٹھتی تھی۔ کہ ایسا نہ ہو میری تیز فہمی پر حرف آئے۔ علم کی یہ قباحت تھی کہ سیدھی سی بات میں بھی اس خیال سے اٹک جاتا تھا۔ کہ حریف نے اپنی تقریر میں جو جو توڑ جوڑ مارے ہیں۔ ان میں سے ایک دقیقہ بھی بے کھولے نہ رہ جائے۔ برخلاف اس کے ذکاوت علم کی ہر بحث کو جھٹ پٹ بلکہ اس گھبراہٹ سے خاک میں ملا دیتی تھی۔ کہ وہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ مگر پھر علم اُس کی بات میں بال بال کے فرق اس تفصیل سے دکھاتا تھا۔ کہ سُننے والے اُکتا جاتے تھے۔ بلکہ جن باتوں کا آج تک کسی نے انکار نہ کیا تھا۔ اُن کے ثبوتوں میں خواہ مخواہ بات کو طول دیکر وقت ضائع کرتا تھا۔ ذکاوت اپنی نمود کی ہوس میں ایسی ایسی باتیں بھی پیش کر دیتی تھی کہ جنہیں نہ سوچا تھا نہ سمجھا تھا۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اکثر دلچسپ اور دل پسند خیالوں کو خوشنمائی سے دکھا کر کامیاب بھی اس قدر ہو جاتی تھی جس کی اُسے خود بھی اُمید نہ تھی *

برخلاف اس کے علم اکثر قدما کے قدموں پر چلتا تھا۔ وہ نئے خیالوں سے بچتا تھا۔ اور ڈرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں ان نتیجوں میں پھنس جائے جنہیں اُس کی نظر پیش بین دیکھ نہیں سکتی۔ اکثر ڈھب ایسے آ پڑتے تھے کہ اگر ذرا ہمت کا میاب کو اور آگے بڑھاتا تو دشمن کو مار ہی لیتا۔ مگر احتیاط جو اس کا جانی رفیق تھا۔ وہ روک لیتا تھا *

حق یہ ہے کہ غلط فہمی سے دونو خالی نہ تھے۔ اور اسی نے دونو کو تیر ہائے اعتراض کے نشانہ پر رکھا ہوا تھا۔ ایجاد اور اختراع تو ذکاوت کے مصاحب تھے اور قدامت اور تقلید علم سے بہت محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی واسطے ذکاوت کو تو وہی بات پسند آتی تھی۔ جو کہ آج تک کسی نے دیکھی ہو

نہ سُنی ہو علم کا قاعدہ تھا کہ بزرگان سلف کے قدم بقدم چلتا تھا اور اُن کی ایک ایک بات پر جان قربان کرتا تھا۔ بلکہ اُس کے نزدیک جس قدر بات پُرانی تھی۔ اُسی قدر سر اور آنکھوں پر رکھنے کے قابل تھی۔ برخلاف اسکے ذکاوت پُرانے پن سے بہت گھبرانی تھی اور ہر رنگ میں نیا شعبدہ دکھاتی تھی اُس کا قاعدہ یہ تھا کہ دلائل سے قائل نہ کرسکتی۔ تو لطائف و ظرائف ہی سہی۔ غرض واہ واہ لئے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ اور اُسے قائل کرنے کی کچھ پروا بھی نہ تھی۔ مگر علم اپنی رائے کو ہمیشہ ایسے سنجیدہ اصول اور بہت تلے قواعد سے سنبھالے رہتا تھا۔ کہ اگر مقدمہ اُس کے برخلاف بھی فیصل ہو جائے۔ تو اُسکے دلائل برجستہ کو یاد کرکے مدّتوں تک تعریفیں ہوتی رہیں *

مناظرہ کے شوقینو دیکھو! اب دونو حریف اپنی اپنی چال بھولتے ہیں۔

چند روز کے بعد اُن کی طبیعتوں میں ایک تبدیلی واقع ہوئی کہ دونو نے اپنی اپنی خاصیت اصلی کو چھوڑ دیا۔ یعنی ہر ایک یہ سمجھنے لگا کہ جو حربہ حریف نے کیا ہے۔ یہی حربہ میں کروں تو دوٹوک فتح ہو جائے۔ یعنی اس نے اُس کے رنگ لینے شروع کئے۔ اور اُس نے اُس کے ڈھنگ پر چلنا شروع کیا۔ چنانچہ دونو طرف یہی چلتا ہتیار ہو گیا۔ یعنی کبھی کبھی ذکاوت دلائل منطقی پر بھی طبع آزمائی کرتی تھی۔ علم اُن دلیلوں کو لچر سمجھ کر فقط مُسکرا دیتا تھا مگر اس طرح کہ اُن سب کی صورت بگڑ جاتی تھی۔ ساتھ ہی اس کے طرفدار چلاّتے کہ واہ وا دلیل کا نام بھی نہ تھا۔ یہ تو باتوں ہی باتوں کا مصالح تھا۔ ان تجربوں میں دونو نقصان پر نقصان پاتے تھے۔ اور خود اپنی حقیقت کو دشمن کے ہاتھوں میں ڈال کر سُبک ہوتے تھے۔ اور ذلّتیں اُٹھاتے تھے۔ غرض جس طرح ذکاوت کی طبیعت میں متانت و وقار اور بات میں بوجھ بھار نہ تھا۔ اسی طرح علم کے کلام میں ظرافت کا نمک اور رنگینی کا نقش و نگار نہ تھا۔ دو قدم چلتا اور گر پڑتا *

یہ مباحثے ایسے مُدّت دراز تک جاری رہے کہ لازم ملزوم ہو گئے۔ اور عالم بالا میں بھی فرقے فرقے ہو کر دونو طرف جتھے بندھ گئے۔ چنانچہ ذکاوت کو زہرہ نے اپنے دامن حمایت میں لے لیا۔ اور تبسّم۔ تمسخر۔ مزاح۔ دل لگی کو اس کے ساتھ کرکے کہا کہ حسن و جمال کی پریوں میں جاکر جلسے کیا کرو۔ ادھر علم پر مشتری کی نظر عنایت رہی۔ مگر وہ تو خود خشک مغز تھے اپنے محل سے باہر ہی نہ نکلتے تھے اور جب نکلتے تھے تو عصمت۔ حرمت۔ عزت۔ محنت۔ اعتدال۔ تحمّل تقوے رو کھے۔ پھیکے۔ کبھی کبھی کے بڈّھے اور پُرانے بُڑھیاں جلو میں لیکر نکلتے تھے اور کسی درگاہ یا خانقاہ تک جاکر چلے آتے تھے ؛

خوش بیانو دیکھنا! طنز و تعریض کی نہ ٹھہرے۔ نہیں تو خواہ مخواہ لڑائی ہو پڑیگی۔

نئی بات یہ ہوئی کہ ذکاوت کے سنگار خانے میں زیور و لباس پہنانے کے لئے دو کاردانوں کی ضرورت ہوئی۔ اور اُس میں طنز اور تعریض آکر نوکر ہو گئے اُنہوں نے اپنی رفاقت میں ایک شخص کو رکھا تھا کہ جسے بغض دیوزاد کہتے تھے اس کے ہاتھ میں کمان تھی۔ اور پشت پر ایک ترکش آویزاں تھا جس میں طعن و تعریض نے تیر بھرے تھے اور عداوت کے زہر میں بُجھائے تھے۔ ان تیروں کا اثر یہ تھا کہ جہاں لگتے وہاں ایسے جم کر بیٹھتے کہ نہ کسی جرّاح کا جتن چلتا نہ کسی حکیم کا ہنر پیش جاتا۔ چنانچہ جب علم کسی امر مُفید یا غور کے کام میں مصروف ہوتا یا اپنے معتقدوں کو فیض علم پہنچاتا۔ یہ اس وقت ذکاوت کی طرف سے تیر مارا کرتا۔ اس کا بندوبست اور کچھ نہ ہو سکا فقط اتنا ہوا کہ مشتری نے نکتہ چینی اور غلط گیری کو دو ڈھالیں دیکر ساتھ کر دیا کہ اگر جواب ترکی بہ ترکی نہ ہو سکے تو اس سے روکا کرو۔ چنانچہ یہ دونو اکثر تیروں کی نوکیں توڑ دیتے تھے۔ کبھی بھال نکال کر پھینک دیتے تھے۔ کبھی اُسی پر اُلٹ دیتے تھے ؛

جب سلطان آسمانی نے دیکھا کہ ان کے آئے دن کے رگڑوں جھگڑوں سے عالم بالا کے امن میں خلل آنے لگا تو بہت خفا ہوا اور ارادہ کیا کہ ان دونو جھگڑالوؤں کو عالم خاکی میں ڈال دے چنانچہ آخر کار دونو دُنیا میں آپڑے اور اپنے قدیمی جھگڑے یہاں بھی جاری کر دئے۔ یہاں دونو کے ساتھ بڑے بڑے گرمجوش معتقد جمع ہو گئے **ذکاوت** نے اپنی خوشنمائی سے نوجوانوں اور رنگین مزاجوں کو لُبھا لیا اور **علم** نے اپنی متانت و وقار سے پُرانے پُرانے بڈھوں کو پھُسلایا۔ ان لوگوں کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں نئے نئے شگوفے کھلنے لگے اور بڑے بڑے اثر اس کے ظہور میں آئے۔ چنانچہ **ذکاوت** کے جلوس کے لئے گلزار۔ اور پُر بہار سیرگاہیں سجائی گئیں کہ جو اُس کے قدردان ہوں وہاں استقبال کو حاضر ہوں۔ اسی طرح **علم** کے لئے مدرسے۔ مسجدیں۔ درگاہیں اور خانقاہیں قرار پائیں دونو جتھے اس پر جان دیتے تھے کہ شان و شکوہ اور ناموری اور دریا دلی میں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں۔ اس طرح کہ اپنے حریف کو گرد کردیں۔ اور اس عقیدے کے پھیلانے میں عرق ریزی کر رہے تھے کہ جو مخلوق دنیا میں پیدا ہو۔ اُسے واجب ہے کہ دونو میں سے ایک فریق میں ضرور داخل ہو۔ ساتھ اس کے یہ بھی تھا کہ جو شخص طرفین میں سے کسی کی بارگاہ میں ایک دفعہ بھی جا نکلے پھر اُسے دوسرے کی نظر عنایت کی اُمید نہ رکھنی چاہئے۔ اس خاکدان ظلمانی میں ایک خاکی جماعت تھی کہ وہ دونو میں سے ایک کو بھی نہ مانتی تھی۔ یہ لوگ روتی صورت سوتی مورت۔ **دولت** کے بندے تھے اور اُسی کی عبادت کرتے تھے۔ زر و مال کے خزانے اُن کے عبادتخانے تھے۔ وہاں کیا **علم** کیا **ذکاوت** کسی کی بھی دُعا قبول نہ ہوتی تھی اور سبب اس کا یہ تھا کہ اُن کی آنکھوں پر روپے کی چربی چھائی ہوئی تھی اور کانوں میں غفلت کی روئی تھی **ذکاوت** نے اُن پر بہت بہت گل افشانیاں کیں مگر اُن کے

لبوں پر کبھی تبسّم کا رنگ بھی نہ آیا اور علم نے بھی اپنی فصاحت و بلاغت سے بہت دماغ سوزی کی تھی مگر اُن کے طبعِ خوابیدہ نے پھُریری بھی نہیں لی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کی آنکھیں روشن بھی ہو جاتی تھیں۔ مگر دولت کا ایک مُرید خاص اُن پر تعینات تھا وہ اُسی وقت آکر اُن کی آنکھوں میں ایک سُرمہ دے جاتا تھا کہ ہر چیز اُنھیں چھوٹی اور حقیر ہی نظر آتی تھی۔ غرض اُنکی کم نظری اور بے اعتنائی علم اور ذکاوت دونو کو بُری معلوم ہوئی چنانچہ یہ دونو متفق ہو گئے اور اپنے اپنے معتقدوں کو چڑھا کر بھیجا۔ اُنھوں نے اُسی وقت دولت پرستوں کے عبادت خانوں کا رُخ کیا اور جاتے ہی کسی کے پہلو میں اشاروں۔ کنایوں کی چٹکیاں لیں۔ اور کسی کی بغل میں ظرافت کی گدگدیاں شروع کر دیں۔ اُس وقت سارے دولت پرست چونک پڑے اور جب کچھ بن نہ آیا تو گھبرا کر روپے کو مدد کے لئے بُلایا۔ روپے کے پاس بڑے نقش اور منتر تھے۔ وہ آیا اور اپنے سارے ہتکھنڈے چلتر کام میں لایا۔ مگر کوئی پیچ اُس کا چل نہ سکا۔ پھر بھی اتنا ہوا کہ ذکاوت اور علم نے جو اپنے اپنے معتقد بھیجے تھے اُن میں پھُوٹ ڈال دی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے اپنے آقاؤں کے راز کھولنے شروع کر دئے یعنی جو کچھ ذکاوت اور علم تحریر کرتے جھٹ دولت پرستوں کو خبر جا پہنچاتے۔ بلکہ جب کچھ تجویز دولت پرستوں کی ذلّت کے لئے عمل میں آتی۔ تو یہ رشوت خوار کارگزار دل میں بُرا مانتے۔ اور اگر کچھ حکم لے کر جاتے بھی تو دولت پرستوں کے سامنے خوشامد کے پیرایہ میں ظاہر کرتے۔ وہ باوجود اُس کے دل میں اُنھیں بھی حقیر ہی سمجھتے تھے۔ جب یہ خوشامدی رفتہ رفتہ دولت اور دولت پرستوں کے درجہ عنایت تک جا پہنچے تو خوشامد کی بدولت بڑے بڑے انعام اور جاگیریں حاصل کیں۔ چند روز کے بعد ایسے بددماغ ہوئے کہ جو اہل عزت خود اُن کے

آقاؤں کے مصاحب تھے اُن سے پہلو مار کر چلنے لگے اور اُن کے مقابل میں اپنے تئیں بہ نظر فضیلت دیکھنے لگے ۔

القصہ جب **ذکاوت** اور علم دونو نے دیکھا کہ اہلِ دُنیا کا وہ حال ہے۔ اور جو نوکر اپنے تھے وہ سب نمک حرام ہو گئے تو دونو نے مل کر دو عرضیاں تیار کیں جن میں دولت اور دولت پرستوں کی زیادتیاں اور اپنے نمک حراموں کی بد ذاتیاں سب لکھیں۔ اور سلطان آسمانی کی خدمت میں بھیج کر التجا کی کہ ہمیں ہماری قدیمی آرامگاہ میں جگہ مل جائے ۔ یہ عرضی سُن کر سلطان آسمانی داہنے ہاتھ کو بڑے زور شور سے گرجے ۔ اس کے یہ معنی کہ ان سب کا روسیاہ کرو ۔ اور دونو ہمارے پاس چلے آؤ ۔ اس حسن طلب کو نہایت غنیمت سمجھے اور خوشی خوشی شکریئے کرتے ہوئے چلنے کو تیار ہوئے ذکاوت نے جھٹ بازو پھیلائے اور غبار سے دامن جھاڑتی ہوئی آسمان ہوا کو اڑی لیکن اُس فضائے لا انتہا میں کہ جہاں نہ راہ تھی نہ رہنما ۔ نظر دُور تک کام نہ کر سکتی تھی اس لئے چند ہی قدم پر رستہ بھُول گئی ۔ علم رستے خوب جانتے تھے ۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی پر خوب ہلائے ۔ مگر اُن کے بازوؤں میں زور نہ تھا چھوٹی چھوٹی اُڑانیں کیا کرتے تھے ۔ غرضکہ ہاتھ پاؤں مار کر دونو زمین پر آ پڑے اُس وقت ایک دوسرے کی مصیبت کو خیال کر کے سمجھے کہ اب اتفاق کے سوا گزارہ نہیں ۔ ناچار دونو نے ہاتھ ملائے ۔ اور پھر اُڑے ۔ علم کو تو ذکاوت کی قوتِ پرواز کا سہارا ملا ۔ اور ذکاوت کو علم دُوربین نے رستہ بتایا ۔ پلک مارتے سلطان آسمانی کے دربار میں جا داخل ہوئے چونکہ بگاڑ کے مزے دونو نے خوب چکھ لئے تھے اس لئے اب کی دفعہ دونو میں بہت محبت اور اخلاص ہوا ۔ مگر ذکاوت نے علم کو صلاح دی کہ بھائی تم ذرا حسن ظرافت اور اسکی سہیلیوں سے نشست برخاست رکھا کرو ۔ اسی طرح انہوں نے ذکاوت کو سمجھایا کہ تم ذرا

صلاح و اعتدال کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرو - ان صحبتوں نے دونو کی طبیعتوں میں بڑا اثر کیا - علم کی خشک دماغی کو حسن اور ظرافت کی طراوت پہنچی - ذکاوت کی شوخی و طراری نے صلاح سے اصلاح پائی - دونو آہستہ آہستہ عالم بالا کے پریزادوں میں ایسے ہر دل عزیز ہو گئے کہ جس جلسہ میں یہ نہ ہوں - اُس میں رونق ہی نہ معلوم ہوتی تھی - چند روز کے بعد سلطان آسمانی کے ایما سے دونو نے شادیاں کر لیں اور اُن کی نسلوں سے علوم و فنون کی اولاد کے سلسلے جاری ہو گئے ؁

شُہرتِ عام اور بقائے دوام کا دَربار

اے ملکِ فنا کے رہنے والو دیکھو ! اس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں - بہت سے حبُّ الوطن کے شہید ہیں جنھوں نے اپنے ملک کے نام پر میدان جنگ میں جاکر خونی خلعت پہنے - اکثر مُصنّف اور شاعر ہیں جنھیں اُسی ہاتف غیبی کا خطاب زیبا ہے - جس کے الہام سے وہ مطالب غیبی ادا کرتے رہے اور بے عیبی سے زندگی بسر کر گئے - ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں جو بزم تحقیق کے صدر - اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے - بہت سے نیکبخت نیکی کے رستے بتلاتے رہے - جس سے ملکِ فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے ؁

بقائے دوام دو طرح کی ہے - ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائیگی کہ اُس کے لئے فنا نہیں - دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں - حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے - یا تو ثواب آخرت کے لئے - یا دُنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے ہوئے -

لیکن میں اس دربار میں اُنہیں لوگوں کو لاؤنگا جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرقِ فشاں کا صلہ اور رنجہائے عظیمہ کا ثواب فقط دُنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا - اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے - اُن کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں - مگر بڑا فکر یہ ہے - کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں اُن کی حق تلفی نہ ہو جائے - کیونکہ جن بچاروں نے ساری جانفشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا ان کے حصہ میں کسی طرح کا نقص ڈالنا سخت ستم ہے - اسی لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مؤرخین سے مدد مانگنی پڑی چنانچہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں کہ انہوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر عنایت کی اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے مقابلہ میں گزری - ناموران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ اُنھوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا - میں اس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا - چونکہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں اس لئے عرض کرتا ہوں ؂

خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں - اور چلتے چلتے ایک میدان[۱] وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں جس کی وسعت اور دلفزائی میدانِ خیال سے بھی زیادہ ہے - دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ اُنہیں محاسب فکر شمار کر سکتا ہے نہ قلمِ تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے - اور جو لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں - وہاں ایک پہاڑ ہے جس کی چوٹی گوشِ سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے - پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے - ہاں حضرتِ انسان کے ناخنِ تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں - میرے دوستو اس رستہ کی دشواریوں کو سر پھوڑ اور

---

[۱] اس میدان کو میدان دُنیا سمجھ لو ؂

سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دے کر ہم خوش ہوتے ہیں۔ مگر بڑی ناانصافی ہے
پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کرے تو ان بلاؤں کو جھیلے جن پر وہ مصیبتیں گذریں
وہی جانیں۔ یکایک قلۂ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ
دلکش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس طرح کہ دل میں جان اور
جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی
تھی۔ جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا۔ لیکن یہ
عجب بات تھی کہ اتنے انبوہ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے۔ جن کے
کان اس کے سننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے ؂

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا۔ اور وہ تعجب فوراً جاتا بھی
رہا یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوبصورت خوبصورت عورتیں
ہیں اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں
پریوں کا لباس پہنے ہیں۔ مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں
نہ پریزاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں غفلت کوئی عیاشی ہے۔ کوئی خود پسندی
کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستہ میں سفر کرتا ہے تو
یہ ضرور ملتی ہیں۔ انہیں میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے
ہیں۔ ان پر درختوں کے جھنڈ سایہ کئے تھے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔
گوناگوں میوے جھوم رہے تھے طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی
نہریں۔ اوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دانش فریب پریاں
پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اور آپس میں چھینٹے لڑ رہی
تھیں۔ مگر ایسے ایسے اُبھاوے بلندی کوہ کے ادھر ہی ادھر تھے۔ یہ بھی
صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں۔ وہ اگرچہ اقوام
مختلفہ عہدہ ہائے متفرقہ۔ عمرہائے متفاوتہ رکھتے ہیں۔ مگر وہی ہیں جو حوصلہ کے

چھوٹے ہمت کے ہیٹے۔ اور طبیعت کے پست ہیں ؛
دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ صاحب ہمت عالی طبیعت تھے وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندی کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔ اسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آیندہ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادہ سے آگے بڑھے کہ بلندی کوہ پر چڑھ جائیں۔ اور جس طرح ہو سکے پاس جا کر اس نغمۂ آسمانی سے قوت روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستہ کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی۔ ایک ہاتھ میں نشان تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزا تھے۔ کسی کی بغل میں ایک کمپاس تھی۔ کوئی پنسلیں لئے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما اور دوربین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرض کہ علم ریاضی اور جر ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس وقت کام میں نہ آ رہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گرمجوشی تمہاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقہ فرقہ میں منقسم ہو گیا۔ کوہ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں ہو لئے۔ وہ تھوڑی ہی دور چڑھے تھے۔ کہ ان کا رستہ ختم ہوا اور وہ تھم گئے مجھے معلوم ہوا کہ ان پست ہمتوں نے صنعت گری اور دستکاری کی راہ لی تھی کہ روپیہ کے بھوکے تھے اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے

تھا جنہوں نے دلاوروں اور جانبازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا۔ اور خیال کیا تھا کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پا لئے۔ مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم دیئے کہ تھوڑا ہی آگے بڑھکر اس کے ہیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے۔ ہر چند برابر قدم مارے جاتے تھے۔ مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھتے تھے۔ میرے فرشتۂ رحمت نے ہدایت کی کہ یہ وہی لوگ ہیں جہاں عقل صادق اور عزم کامل کام دیتا ہے وہاں چاہتے ہیں کہ فقط چالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے ایسے بھی تھے کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے اُتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہو گئے کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو مدد روزگار سے ترقیاں[1] حاصل کرتے چلے جاتے ہیں مگر کوئی ایسی حرکت ناشائستہ کرتے ہیں کہ دفعۃً گر پڑتے ہیں اور آیندہ کے لئے بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے ہم اتنے عرصہ میں بہت اونچے چڑھ گئے اور معلوم ہوا کہ جو چھوٹے بڑے رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں اوپر آکر دو شاہراہوں سے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب ہمت دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان دونو شاہراہوں میں ذرا ذرا آگے بڑھکر ایک ایک بھوت ڈراؤنی صورت ہیبت ناک سورت کھڑا تھا کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک درخت خاردار کا ٹہنا تھا۔ بھوت کا نام دیو ہلاک تھا اور کانٹے وہی ترقی کے مانع اور موت کے بہانے تھے جو اولوالعزموں کو راہ ترقی میں پیش آتے ہیں۔ چنانچہ جو سامنے آتا تھا۔ ٹہنے کی مار منہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خونخوار تھی گویا موت سامنے کھڑی

[1] نی۔ تخیبنت جو ناموری اور ترقی کے خواہاں ہیں اگر سلطنت۔ حکومت۔ دولت۔ شجاعت۔ علمیت وغیرہ کے رستے سے پاہتے ہیں تو خوف جان ہے۔ اگر اور فنون کمال کے رستے لیتے ہیں تو حاسد الانواع واقسام کی بدذاتیوں سے سدِ راہ ہوتے ہیں ٭

ہے اِن کانٹوں کی مار سے غول کے غول اہل ہمّت کے بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے اور ڈر ڈر کر چلاّتے تھے کہ ہے ہے موت! ہے ہے موت!
دوسرے رستہ پر جو بھوت تھا اُس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اُسکے ہاتھ میں نہیں تھا۔ لیکن ڈرانی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اس کی زبان سے نکلتے تھے اس لئے اُس کا مُنہ ایسا بُرا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا اُس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا کہ برابر چھینٹیں اُڑائے جاتا تھا اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا تو اکثر اشخاص ہم میں سے بیدل ہوکر رہ رہ گئے اور بعضے اپنے یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوئے۔ میرا یہ حال تھا کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا اور قدم آگے نہ اُٹھتا تھا۔ اتنے میں اُس شہنائی کی آواز اس تیزی کے ساتھ کان میں آئی کہ بُجھے ہوئے ارادے پھر چمک اُٹھے۔ جس قدر کہ دل زندہ ہوئے اُسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اڑتے گئے۔ چنانچہ بہت سے جانباز جو شمشیرِ علم کئے ہوئے تھے اس کڑک دمک سے قدم مارتے آگے بڑھے گویا حریف سے میدانِ جنگ مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا یہ اُس دہانہ سے نکل گئے اور وہ موت کے دانت نکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے وہ اُس رستے پر پڑے جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا مگر اس آواز کے ذوق شوق نے اُنہیں بھی ایسا مست کیا کہ گالیاں کھاتے کیچڑ میں نہاتے مر پچکر یہ بھی اُس کی حد سے نکل گئے چنانچہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں۔ آگے دیکھا تو ان کی دسترس سے باہر ہیں اور رستہ بھی صاف اور ہموار بلکہ ایسا خوشنما ہے کہ مسافر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ اس میدانِ روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں بخش اور روحانی ہوا چلنے لگی جس سے روح اور زندگانی

کو قوت دوامی حاصل ہوتی تھی ۔ تمام میدان جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا
اُس کا رنگ کبھی نورِ سحر تھا اور کبھی شام و شفق ۔ جس سے قوس قزح کے رنگ میں
کبھی شہرت عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے ۔ یہ نور و سرور کا
عالم دل کو اس طرح تسلّی و تشفّی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے
دھوئے جاتے تھے ۔ اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا ۔
جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا ۔ ناگہاں
ایک ایوان عالیشان دکھائی دیا کہ اُس کے چار طرف پھاٹک تھے ۔ اُس پہاڑ
کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختہ میں ایک پری حور شمائل چاندی کی کرسی پر
بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے جس کے میٹھے میٹھے سُروں نے ان مشتاقوں
کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا ۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور سُروں
سے اب ایسی صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفریں و شاباش دیتی ہے اور کہتی
ہے کہ " خیر مقدم ! خیر مقدم خوش آمدید صفا آوردید " اس آواز سے یہ خدائی
لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا ۔ چنانچہ مورخوں کا گروہ ایک دروازہ پر استادہ ہوا تا کہ
صاحب مراتب اشخاص کو حسب مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے ۔ یکایک وہ
شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز و جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے ۔
اب اُس سے ظفر یابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی ۔ تمام مکان گونج اُٹھا اور
دروازے خود بخود کھُل گئے ۔ جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا معلوم ہوا کہ
کوئی راجوں کا راجہ مہاراجہ ہے چاند کی روشنی چہرہ کے گرد ہالہ کئے ہے ۔
سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے اس کے استقلال کو دیکھ کر لنکا کا کوٹ پانی
پانی ہوا جاتا ہے ۔ اُس کی حقداری جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جاں نثاری
میں حاضر کرتی ہے ۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایہ میں لئے آتے ہیں ۔
فرقہ فرقہ کے علما اور مورخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے ۔ لینے کو بڑھے

اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا - مگر ایک شخص کہن سالہ رنگت کا کالا ایک پوتھی بغل میں لئے ہندوؤں کے غول سے نکلا اور باواز بلند چلایا کہ آنکھوں والو کچھ خبر ہے ؟ دیکھو! دیکھو! ترتیب کے سلسلہ کو برہم نہ کرو- اور نرنکار کے نور کو اجسام خاک میں نہ ملاؤ - یہ کہہ کر آگے بڑھا اور اپنی پوتھی نذر گزرانی - اُس نے نذر قبول کی اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا - تو معلوم ہوا کہ اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا - سب ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے - کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا - اُس وقت ایک بمان یعنی تخت ہوا دار آیا - وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اُڑ گیا معلوم ہوا کہ یہ رامچندر جی ہیں اور یہ والمیک ہے جس نے رامائن نذر دی - سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اَوْر آمد ہوئی - دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو ۳۲ پریاں اُڑائے لئے آتی ہیں - اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے مگر نہایت دیرینہ سال - اسے فرقہ فرقہ کے علما او مورخ لینے کو نکلے مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بیقراری سے دوڑے - معلوم ہوا کہ راجہ تو مہاراجہ بکرماجیت تھے اور تخت سنگھاسن بتیسی - پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے نہ آپ کا سنہ ہٹیگا نہ سکہ مٹیگا - برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور اُنہیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا ٭

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل و قال ہوئی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے - اور اراکین دربار کہتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گذارہ نہیں - اتنے میں وہی ۳۲ پریاں پھر آئیں - چنانچہ ان کی سفارش سے اُسے بھی لے گئے - جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا

لہ کوئی اَوتار کہتا ہے - کوئی بادشاہ ! اقبال ٭

ایک پنڈت آیا ۔ دونو ہاتھ اُٹھا کر اشیر باد کہی اور بقاے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا جس میں ہیرے اور پنے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے ۔ معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور ۳۲ پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی تھی جو اُن کے عہد میں تصنیف ہوئی ۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالیداس شاعر تھا ۔ جس نے اُن کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے ۔ اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھے ۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازہ سے بھی داخلہ شروع ہوا ۔ میں اس طرف متوجہ ہوا ۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فروش جھاڑ فانوس سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے ایک جوان پیل پیکر ہاتھ میں گرزِ گاؤسر ۔ نشاء شجاعت میں مست جھومتا جھامتا چلا آتا ہے ۔ جہاں قدم رکھتا ہے ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے ۔ گرد اُس کے شاہان کیانی اور پہلوانان ایرانی موجود ہیں کہ درفش کاویانی کے سایۂ بے زوال میں لئے آتے ہیں ۔ حبِّ قوم اور حبِّ وطن اُس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے ۔ اُس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا ۔ اور سر پر کلّہ شیر کا خود فولادی دھرا تھا ۔ مؤرخ اور شعرا اُس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے ۔ سب نے اسے بچشم تعظیم دیکھا ۔ اُنہی میں سے ایک پیرمرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا اور ایک کرسی پر بٹھایا جسے بجاے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اُٹھائے کھڑے تھے ۔ پھر پیرمرد نے اہل مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور و شور کے پڑھے ۔ نہیں ! بلکہ اُس کے کارناموں کی تصویر صفحۂ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک رہیگی ۔ بہادر پہلوان نے اُٹھ کر اُس کا شکریہ ادا کیا اور گل فردوس کا ایک طُرّہ اُس کے سر پر آویزاں کر کے دُعا کی کہ الٰہی

یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے۔ تمام اہل محفل نے آمین کہی ٭

معلوم ہوا کہ وہ بہادر۔ ایران کا حامی۔ شیر سیستانی رستم پہلوان ہے اور کہن سال بابوس فردوسی ہے جو شاہنامہ لکھ کر اُس کے انعام سے محروم رہا ٭

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا جس کا حُسن شباب نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاج شاہی تھا مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چُراتی تھی ساتھ اس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا مگر سب اُسے دیکھکر ایسے محو ہوئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مورخ اور محقق اُس کے لینے کو بڑھے مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اُس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لئے تیار ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا۔ ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مورخ تھا اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جاکر سب سے پہلی کرسی پر بٹھا دیا۔ فرشتۂ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشہ کی طرف آجاؤ تاکہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمہیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ سکندر یونانی ہے جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دئے ہیں ٭

اس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہ کیانی اور اُس پر درفش کاویانی جھومتا تھا۔ مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اُٹھا اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا۔ اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی۔ وہ دارا بادشاہ ایران تھا ٭

دفعۃً سکندر نے آواز دی "اُنہیں لاؤ"! جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا کہ مقیشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اُس کے چہرہ کو روشن

کیا تھا ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا سکندر خود اُٹھا اُس کا ہاتھ پکڑ کر لایا اپنے برابر کرسی پر بٹھایا۔ اور پانچ لڑی کا سہرہ اُس کے سر پر باندھا معلوم ہوا کہ یہ **نظامی گنجوی** ہیں اور اس سہرے میں **خمسہ** کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اُٹھا اور تھوڑا سا پانی اُس پر چھڑک کر کہا "اب یہ کبھی نہ کملائینگے"۔

بعد اس کے جو شخص آیا اگرچہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحت رُوحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آچکے تھے اُن سب سے زیادہ عالی رتبہ کے لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر **افلاطون** تھا۔ اور بائیں پر **جالینوس**۔ اُس کا نام **سقراط** تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ **لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے استاد یعنی افلاطون سے دوسرے** درجہ پر بیٹھیگا۔ مگر اس مقدمہ پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلائل زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کرایا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے۔ اور یہ کہہ کر اول **سکندر** کو آئینہ دکھایا پھر **نظامی** کو سلام کرکے بیٹھ ہی گیا۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جبّہ و عمامہ اور طبل و دمامہ رکھتے تھے۔ مگر باہر روکے گئے۔ کیونکہ ہرچند اُن کے جُبّے دامن قیامت سے دامن باندھے تھے۔ اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے۔ مگر اکثر اُن میں طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لئے منتخب ہوئے۔ اُن کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علما و فضلا کا ہولیا۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اُتارے اُن کے ساتھ تھے۔ بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لئے اشیرباد کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ اُن میں **ہارون رشید** اور

دوسرا **مامون رشید** تھا ❊

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک اَور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا - ولایتی استخوان اور ولایتی لباس تھا - اور جامہ خون سے قلمکار رنھا۔ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اُس کے پاس تھے - مگر چونکہ ناواقف تھا - اس لئے کچھ زیور ہاتھ میں لئے تھا - کچھ کندھے پر پڑے تھے - ہرچند یہ جواہرات اپنی آبداری سے پانی ٹپکاتے تھے - مگر جہاں قدم رکھتا تھا بجائے غبار کے آہوں کے دھوئیں اُٹھتے تھے وہ **محمود غزنوی** تھا - بہت سے مصنف اُس کے استقبال کو بڑھے مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا - چنانچہ ایک نوجوان حور شمائل آیا اور **فردوسی** کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا - محمود نے نہایت اشتیاق اور شکرگزاری سے ہاتھ اُس کا پکڑا اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونو کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں - نوجوان ایک عجب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا وہ **ایاز** تھا - اسی عرصہ میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا - مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا - اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہو گئے - مگر تمام علما اور فضلا میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا - اُس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی اُس پر آکر بیٹھ گیا - وہ **بوعلی سینا** تھا ❊

ایک انبوہ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے - بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق اُن کے نقش و نگار سے گلزار رکھتے - وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصور ہیں - اُن کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں - آخر یہ جواب ملا کہ تم مصور بے شک اچھے ہو - مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیا کے مصور ہو - تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں - البتہ انتخاب

ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے چنانچہ **انوری۔ خاقانی۔** **ظہیر فاریابی** وغیرہ چند اشخاص منتخب ہوکر اندر آئے باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا اُس میں سے آبحیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں اس لئے اُس پر پھر تکرار ہوئی۔ اُس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفع اعدا کے لئے تلوار دی ہے۔ مگر ملک مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں تو اعدائے بدنہاد ہمارے خون عزت کے بہانے سے کب چوکیں۔ چنانچہ یہ عذر اُس کا قبول ہوا۔ یہ **انوری** تھا جو باوجود گل افشانی فصاحت کے بعض موقع پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اُس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ **خاقانی** پر اس معاملہ میں اُس کے استاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔ چونکہ اُس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی اس لئے وہ بھی اُس کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہو سکا۔ اسی عرصہ میں **چنگیز خاں** آیا اُس کے لئے گو علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اُسے چشم حقارت سے دیکھ کر تبسّم کیا۔ البتہ مورخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی۔ جب کسی کی زبان سے نسب نامہ کا لفظ نکلا تو اُس نے فوراً شمشیر جوہردار سند کے طور پر پیش کی۔ جس پر خونی حرفوں سے رقم تھا۔ "سلطنت میں میراث نہیں چلتی"۔ علما نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بو آئے وہ قصاب ہے۔ بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعرا نے کہا کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم۔ یا مصوران تصانیف کی تحریر نے رنگ بقا نہ ڈالا ہو اُسے اس دربار میں نہ آنے دینگے۔ اس بات پر اُس نے بھی تامّل کیا اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی۔ اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو

آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اُٹھاتا اتنے میں چند مورخ آگے بڑھے۔ اُنہوں نے کچھ ورق دکھائے۔ کہ اُن میں طورہ چنگیز خانی یعنی اُسکے مُلکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اُسے دربار میں جگہ دو۔ مگر اُن کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو۔ اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو ؛

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا۔ اُس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اُس کے لئے چند علما نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا[1]۔ جس وقت اندر لائے تو اُس کے لئے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی لیکن کمر میں ایک طرف اُصطرلاب دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا تھے۔ اُن کا نام محقق طوسی تھا چنانچہ اُنہیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اُسے نو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو شیخ بو علی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھا لیا کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانکے شکریہ ادا کرتا ہوں ؛

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی مگر وہ سب کو دروازہ پر چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا۔ کیونکہ وہ خود مؤرخ تھا۔ رستہ جانتا تھا۔ اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہل تصنیف میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمہیں قلم تحریر دیا ہے اسے اظہار واقعیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لئے کام میں لانا چاہیے یا اغراض نفسانی اور ہرزبانی میں؟ تمام مورخ ایک دوسرے

[1] اس کے عہد میں علوم و فنون نے بہت ترقی کی تھی خصوصاً علم ہیئت کی کتابیں اور رصد خانے کی تعمیر اس کی شاہد حال ہے ؛

کا مُنہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے؟ اُس وقت تیمور نے ابن عرب شاہ کے بُلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ چنانچہ اُس کا نام مُصنّفوں کی فہرست سے نکالا گیا ٭

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آزاد وضع قطع تعلّق کا لباس بر میں خاکساری کا عمامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا مورخ اور شاعر سر جُھکائے اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازہ پر آکر ٹھیرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا معذور رکھو۔ میرا ایسے مقدّموں میں کیا کام ہے اور فی الحقیقۃ وہ معذور رکھے جاتے۔ اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب اُن کے انکار پر غالب نہ آتا وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشۂ مینائی اُن کے ہاتھ میں تھا کہ اُس میں کسی کو دودھ کسی کو شربت کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین اُنہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھکر کہیں نہ بیٹھے فقط اس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظ شیراز تھے اور شیشۂ مینائی اُن کا دیوان تھا جو فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔ لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے۔ کہ دُور سے دیکھا۔ بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں اُن کے ایک پیر مرد نورانی صورت جن کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی۔ اور خندہ جبینی نے ایک طرّہ سر پر آویزاں کیا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے۔ مگر انہیں دیکھکر سب نے قدم آگے بڑھائے کیونکہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اور اُن کی گلستان۔ بوستاں کو نہ جانتا تھا۔ انہوں نے کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اس بیچارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی۔ لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر

اُن سے واقف تھے - اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے - وہ اُن کے مشتاق معلوم ہوئے باوجود اس کے بہ ہنسے اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے "دُنیا دیکھنے کے لئے ہے برتنے کے لئے نہیں"۔

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا - چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا جس کے چہرہ سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا - اُس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے ہے - بلکہ چغتائی خاندان کے مورخ صاف اُس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے اُس نے باوجود اس کے ایک کُرسی جس پر تیموری تمغا بھی لگا تھا گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا - ہمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا - مگر پھر تاج شاہی پر انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ بے حق بے استقلال ہے - اُس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلینگے اور فخر کرینگے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کو انبوہ کثیر - ایرانی - تورانی - ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لئے آتا تھا - وہ جس وقت آیا تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھیں اور رضامندی عام کی ہوا چلی - تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اُس کو مسلمان سمجھتے تھے - ہندو اُسے ہندو جانتے تھے - آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا - نصارے اُس کو نصارے سمجھتے - مگر اُس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے - اُس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کر کے بداؤنی پر خون کا دعوے کیا کہ اُس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا اور وہ فتحیاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ **ابوالفضل** اور **فیضی** کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی - سب نے کہا - نیت کا پھل ہے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا۔ اُس کے نور جمال سے دیکھتا تھا۔ اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھکر سب مُسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لئے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی ٭

شاہجہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مورخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لئے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت اُن عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لئے تھے جو اُس کے نام کے کتابے دکھاتی تھیں اور سینکڑوں برس کی راہ تک اُس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضامندیٔ عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچّوں کو ساتھ لئے آیا۔ کہ اپنی آنکھوں کا اور بچّوں کے خون کا دعوے کرتا تھا۔ یہ شہریار۔ شاہجہاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ اور بچّے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کا آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا بدنیتی اور خودغرضی سے نہیں کیا۔ بلکہ خلق خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہرحال اُسے دربار میں جگہ ملی۔ اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلہ میں معزز درجہ پر ممتاز ہوا ٭

ایک تاجدار آیا۔ کہ جبّہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا۔ مگر دوسرے ہاتھ میں جو فرد حساب تھی۔ اُس میں غرق تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پرتا لتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ انہیں خانقاہ میں لے جانا چاہئے اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں۔ لیکن ایک ولایتی کہ

بنتا ہر منقطع اور معقول نظر آتا تھا۔ وہ دونو ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اسے
اراکین دربار ہمارے ظل سبحانی نے اس کمبخت سلطنت کے لئے بھائی سے بیگر
باپ تک کا لحاظ نہ کیا۔ اس پر بھی تمہارے اعتراض اسے اس دربار میں جگہ
نہ دینگے۔ یہ لطیفہ اس نے اس مسخراپن سے ادا کیا کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی
کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر بدنامیں بھی جگہ دیدو۔ معلوم ہوا کہ
عالمگیر بادشاہ اور ساتھ اس کے نعمت خان عالی تھا ٭

اس کے ساتھ ہی ایک بینڈا جوان۔ دکھنی وضع۔ جنگ کے ہتیار لگائے
راجگی کے سکے تمغے سے سجا ہوا آیا۔ اس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے۔ بلکہ
عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا۔ مگر وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ اور
بولا کہ صاحب ہمت کو جگہ دو یا نہ دو وہ آپ جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ سیواجی تھا
جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قائم ہوئی ہے ٭

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے
ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنفوں اور مورخوں میں سے
کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے۔ کہ کوئی ان میں گویا اور
کوئی بھانڈ کوئی مسخرا نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے۔ کیونکہ ایک
ولایتی دلاور ان کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کئے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار
سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مخمل رومی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا
تاج شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیر ران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع
بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو نکالو۔ ان کا یہاں
کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور
نادر شاہ تھا۔ جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کرکے تاج ہندوستان
سر پر رکھا تھا۔ اسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی ٭

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا۔ اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے لوگ۔ تھم ہاتھ دامن پھیلاتے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سودا تھے ٭

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کئے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار متقی پرہیزگار دم میں ڈاڑھی چٹ بنگ کا سونٹا کندھے پر ٭

جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اور اکثر جگہ قلمکاری اس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے۔ مگر جب کچھ کہتے تھے جرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے ٭

ایک پیر مرد دیرینہ سال۔ محمد شاہی دربار کا لباس۔ جامہ پہنے کھڑکی دار پگڑی باندھے۔ جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور ان کے دست و گریبان ہو جاتے۔ لیکن چار رفقا کسار اور پانچواں ناچار ان کے ساتھ تھا۔ بچا لیتے تھے۔ بڈھے

میر امّن دہلوی چار درویش کے مصنف تھے۔ اور بانکے صاحب مرزا سرور۔
فسانہ عجائب والے تھے۔ **ذوق** کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔
اُنھوں نے اندر آ کر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اٹھ کر ملک الشعرائی کا
تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ **غالب** اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے
نہ تھے بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب
کے کان گنگ کر دئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ
کرتے رہ گئے ٭

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس۔ اتنے میں آواز آئی
کہ **آزاد** کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔
مگر وہیں سے پھر کوئی بولا۔ کہ اُسے جن لوگوں میں بٹھا دو گے بیٹھ جائیگا۔ اتنے
میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ
رکھی ہے اُسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہئیے۔ اس مقدمہ میں قیل و قال
شروع ہوئی میں چاہتا تھا۔ کہ نقاب چہرہ سے الٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں
کہ میرے ہادی ہمدم یعنی فرشتہ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور چپکے سے کہا کہ ابھی
مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھول گیا۔ اور خدا کا
شکر کیا۔ کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی۔ مُردوں سے زندوں میں تو آیا ٭

خاتمہ

اگرچہ خیالات کے جلسے جمے ہوئے ہیں۔ اور اشخاص تصوری زبان سے
بے اجسام سے طلسم کاری کر رہے ہیں لیکن سو کے قریب صفحے سیاہ ہو چکے۔
اب جلسہ ختم۔ اور کچھ عرصہ کے لئے کلام کا دروازہ بند۔ اے اہل انجمن! آپ کا
آنا۔ مبارک آنا۔ قدم بر چشم مگر جلسہ آیندہ کی ابھی سے گزارش قبول ہو۔
کہ حصۂ دوم کا سامان بہم پہنچے ٭

نظمِ اُردو

۸ مئی ۱۸۷۴ء کو نظمِ اُردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا کہ زبان کی تاریخ میں مدۃ العمر یادگار سمجھا جائیگا۔ نظمِ مذکور کی آگ ایک چقماق سے نکلی تھی جس کا ایک پرزہ شعرائے آتش بیان کی طبع روشن تھی۔ دوسرا پرزہ امرائے زندہ دل کی گرم طبیعت۔ ایک کی شوخی نے غزل اور قصیدہ کو ولادت دی۔ اور دوسرے کی قدردانی نے اُسے پال کر پرورش کیا۔ مخلوق مذکور اُس حالت میں بڑھیا ہو کر اپنی حد سے گزر گئی۔ مختصر یہ کہ وہی معمولی مضمون تھے جو پہلے استادوں نے نکالے تھے۔ موجودہ شاعر چبائے ہوئے نوالوں کی طرح انہیں لیتے تھے الفاظ اُدل بدل کرتے تھے۔ اور پڑھ پڑھ کر آپس میں خوش ہوتے تھے۔ صاحب ڈائرکٹر بہادر نے سال مذکور میں میرے اُستاد پروفیسر آزاد کو ایما فرمایا۔ انھوں نے اُس مطلب پر مناسب وقت ایک لکچر لکھا۔ اور شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک مثنوی میں دکھائی۔ حضور ممدوح کی تجویز سے ایک تاریخ مقرر ہوئی۔ جلسہ ہوا۔ اہل علم۔ اہل ذوق جمع ہوئے نثر اور نظم مذکور پڑھی گئی۔ اور سب نے صلاح کر کے ایک مشاعرہ قائم کیا۔ کہ شعرا ہر قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کیا کریں۔ ۱۱ مہینے تک مشاعرہ قائم رہا۔ اس وقت نظم مذکور کی شروع پر لوگوں نے کچھ کچھ مخالفت کی۔ مگر ۱۴ برس کے عرصہ میں اتنا اثر ہوا کہ اب ہندوستان کے مشہور شہروں میں ویسی ہی نظموں کی آوازیں آتی ہیں۔ لکچر اور مثنوی مذکور اب نہیں ملتی۔ اور لوگ طلبگار رہتے ہیں۔ چونکہ یہ تاریخی مطلب ہے۔ اسکے حرفوں کو مٹنے دینا نہیں چاہئے۔ اس لئے اس کتاب میں لکچر مذکور کا درج کرنا مصلحت ہے تاکہ نئی نسل کے خیالات میں وسعت پیدا کرے ؎

راقم بندہ غلام حیدر نثار شاگرد حضرت آزاد

مضمون لکچر

اے حاضرین باتمکین! آج میں ایک ایسے امر پر گفتگو کرنے کو حاضر ہوا ہوں جس میں دخل دینا میری حد سے باہر ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت میں اُس ملک وسیع کی زبان سے متعلق ہے جسے اہل عالم مملکت ہندوستان کہتے ہیں۔ اُس کا حال ایسا ہو رہا ہے کہ حبّ الوطنی کسی طرح خاموش نہیں رہنے دیتی۔ امر مذکور کیا ہے؟ نظم اور انشا پردازی اُردو زبان کی ہے۔ جو کہ ہمارے ہر قسم کے ادائے مطلب اور عام تصنیفات۔ اور تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ اس وقت یہ موقع نہیں۔ کہ زبان ہند کی تحقیق میں کاوش کرکے پُرانی بنیادیں نکالی جائیں اس لئے یہی کہنا کافی ہے کہ زبان موجودہ ہماری یعنی اُردو زبان حقیقت میں ہندوستان کی برج بھاشا ہے جس میں فارس کے مسافر نے آکر عمل دخل کیا۔ اور صاحب خانہ نے اس بن بلائے مہمان کو اپنی وسعت اخلاق سے اُس کے خاطر خواہ جگہ دی ۔

سب جانتے ہیں کہ خود برج بھاشا اپنے عہد میں عام زبان تھی مگر دربار اور علموں پر ان کا قبضہ تھا۔ یعنی سنسکرت کہ جس کی گود میں فصاحت و بلاغت کے دریا لوٹتے تھے۔ اور برج بھاشا وہ زبان تھی جو کہ گھروں میں کام کاج کی باتوں اور بازاروں میں سودے سلف کے لین دین سے خاص و عام کی ضرورتیں پوری کرتی تھی۔ چونکہ بھاشا علمی اور تصنیفی زبان نہ تھی۔ اس واسطے اس میں استعارہ اور تشبیہ سے انشا پردازی کی باریکیاں اس اعلیٰ درجہ پر نہ پہنچیں جو سنسکرت میں تھیں پھر بھی وہ ہر ایک موقع پر اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنا مطلب پورا پورا ادا کرتی تھی۔ جس کی کیفیت کو جاننے والے ہی جانتے ہیں ۔

جب بھاشا سے اُردو پیدا ہوئی تو کئی سو برس تک اُس میں باتیں ہی باتیں رہیں یعنی تحریر اور تصنیف تک نوبت نہ پہنچی۔ لیکن جس طرح کوئی زمین بے رونیدگی

کے نہیں رہ سکتی - اسی طرح کوئی زبان بے نظم کے نہیں رہ سکتی - چنانچہ پریشان شعر تو کئی سو برس سے اردو میں چلے آتے تھے - جب شاہجہاں کے بعد زبان موجودہ کی عمر سو برس کی ہوئی تو ولی شاعر پیدا ہوئے اور ساتھ ہی جا بجا دیوان ترتیب ہونے لگے ❊

اُردو کی مالک اُن لوگوں کی اولاد تھی - جو اصل میں فارسی زبان رکھتے تھے - اسی واسطے انہوں نے تمام فارسی بحریں اور فارسی کے دلچسپ اور رنگین خیالات اور اقسام انشا پردازی کا فوٹو گراف فارسی سے اُردو میں آتا رہا۔ تعجب یہ ہے کہ اس نے اس قدر خوش ادائی اور خوشنمائی پیدا کی - کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے انہیں بھی مٹا دیا - چنانچہ نسیم عاشق پپیہے اور کوئل کی آواز اور چمپا - چنبیلی کی خوشبو کو بھول گئے - ہزارہ و بلبل اور نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں اُن کی تعریفیں کرنے لگے - رستم و اسفندیار کی بہادری کوہ الوند اور بے ستون کی بلندی - جیحون - سیحون کی روانی نے یہ طوفان اٹھایا کہ ارجن کی بہادری ہمالہ کی ہری ہری پہاڑیاں برف سے بھری چوٹیاں اور گنگا جمنا کی روانی کو بالکل روک دیا ❊

اس میں شک نہیں کہ ایک اعتبار سے ہمیں فارسی زبان کا ممنونِ احسان ہونا چاہئے کہ اس کی بدولت ہمارے کلام میں بلند پروازی اور جوش و خروش کا زور پیدا ہو گیا - اس کے استعارہ اور تشبیہوں سے بہت سے نازک اور لطیف خیالات کے ظاہر کرنے کی قوت ہو گئی - لیکن چونکہ یہ خیالات فارسی کی نظم و نثر سے آئے ہیں جہاں کے چمن میں بار یک بار یک استعاروں کی نسیم خوشبو پھیلاتی ہے - اور لطیف لطیف تشبیہوں کی شبنم شاداب کرتی ہے - اس لئے انہیں پھولوں کا عطر اس زبان میں آیا بیشک اُن کی بلند پروازی اور نازک خیالی جس درجہ پر ہے اس کی حد نہیں لیکن اصل مطلب کو ڈھونڈو تو باریکی اور تاریکی الفاظ اور استعاروں کے اندھیرے میں ایک جگنو ہے کہ کبھی چمکا اور کبھی غائب ❊

اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغہ اور بلند پروازیوں کے بازوؤں سے اُڑے۔ قافیوں کے پروں سے فر فر کرتے گئے۔ الفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے۔ اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم کسی شے پر رغبت یا اُس سے نفرت کسی شے سے خوف یا خطر۔ یا کسی پر قہر یا غضب۔ غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اُس کے بیان سے وہی اثر۔ وہی جذبہ۔ وہی جوش سُننے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو اصل کے مشاہدہ سے ہوتا۔ بیشک مبالغہ کا زور۔ تشبیہ اور استعارہ کا نمک۔ زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیئے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک تشبیہ اور استعارہ ہمارے مطالب میں ایسے ہونے چاہئیں۔ جیسے کسی معرکہ یا دربار یا باغ کی تصویر پر آئینہ۔ کہ اُس کی کیفیت کو زیادہ روشن کرے۔ نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصلی حال ہی نہ دکھائی دے۔ تب اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ ہمیں چاہیئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اَور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولینگے۔ تو دیکھینگے۔ کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھُلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ ہار طرّے ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں! اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی مُنہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو۔ جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے ؎

اے میرے اہل وطن! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامان آرائش سے مفلس کہتا ہوں۔ نہیں۔ اُس نے اپنے بزرگوں سے لمبے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے مگر کیا کرے کہ خلعت پرانے ہو گئے۔

اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے۔ مگر نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں۔ اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہموطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ اب مجھے دوسری طرف متوجہ ہونا واجب ہے یعنی اے انگریزی کے سرمایہ دارو! تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو۔ اور تمہیں افسوس نہیں آتا۔ تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے۔ اور تمہیں اس کا درد نہیں آتا۔ اپنے خزانہ اور نئے توشہ خانہ سے ایسا بندوبست نہیں کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر کے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو۔ یہ وطن کا فرض ہے کہ قرض سے زیادہ اس کا ادا کرنا واجب ہے ÷

بھاشا پر جو فارسی نے اثر کیا اور اُس سے نظم اور انشاے اُردو نے ایک خاص لطافت حاصل کی۔ وہ اُن لوگوں کی بدولت ہوئی کہ بھاشا اور فارسی دونو سے واقف تھے۔ تم خیال کرو کہ جو اُس وقت بھاشا اور فارسی کا حال تھا۔ آج بعینہ اُردو اور انگریزی کا حال ہے۔ پس اس کی نظم میں اگر انگریزی کے خیالات کا پرتو حاصل ہوگا۔ تو انہی لوگوں کی بدولت ہوگا جو دونو زبانوں سے واقف ہونگے۔ اور سمجھینگے کہ انگریزی کے کون سے لطائف اور خیالات ایسے ہیں جو اُردو کے لئے زیور زیبائش ہو سکتے ہیں۔ اے میرے اہلِ وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے۔ کہ عبارت کا زور، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان۔ تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں۔ کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں۔ جس میں کچھ وصل کا لطف۔ بہت سے حسرت و ارمان۔ اُس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب۔ ساقی۔ بہار۔ خزاں۔

فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دُور دُور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں۔ اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اُٹھا سکتے یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں ؛

پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا۔ کہ ہم اپنے زوروں کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ اور جواہر کے خزانے کام کی جگہ نہیں لگا سکتے بے جگہ لٹاتے ہیں کبھی حسرت آتی ہے۔ جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں۔ اور مضمون کی جان پہ احسان کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں کیا؟ سُن کر ترسیں اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔ کاش ہم جو کچھ نثر لکھتے ہیں اتنی ہی قدرت نظم پر بھی ہو جاوے۔ جسکے اعلےٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ردیف و قافیہ کے ساتھ ایسی دلپسند بحریں اور نازک خیالیوں کے سامان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہمت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں ؛

اے میرے اہل وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہیگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہ سبب بیقدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہونگے۔ کئی پُرانی ہوزہیں باقی ہیں وہ چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہوگی۔ اور اُردو میں نظم کا چراغ گل ہوگا۔ میرے اہل وطن! آؤ آؤ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اُٹھو اُٹھو وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری

کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائیگی۔ کہ اُن کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی۔ اور اس فخر آبائی۔ اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے ؂

اس میں کچھ شک نہیں کہ سردست یہ کام کچھ مشکل ہے۔ کیونکہ ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے۔ وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحر البیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کرکے پیدا کیا ہے۔ دلوں کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کرکے بہائے ہیں۔ جب یہ دلپسند خیالات شُستہ الفاظ۔ پاکیزہ ترکیبیں خوشنما تراشیں مضمون کی گرمیاں۔ انداز کی شوخیاں پیدا ہوئی ہیں۔ کہ سُننے والوں کے کانوں میں رس ڈالتی ہیں۔ اگر کوئی موزوں طبع چاہے۔ کہ عام چیزیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اُن میں سے جس کو چاہے لے لے اور اُن پر شاعری خرچ کرکے وہ ہی لطف کلام میں پیدا کرلے۔ تو آج نہایت مشکل بات ہے۔ تمام عالم کی تعریفیں اور ہمارے شکریئے اُن مزاروں پر پھول برساتے ہیں جن کے سونے والوں نے اُنہی چھوٹے چھوٹے احاطوں میں وہ کچھ کیا کہ سالہا سال چاہئیں۔ جو ویسے لوگ پیدا ہوں۔ ویسی کوششیں کریں۔ اور ویسے ہی لطیف اور خوش آیندہ انداز عموماً زبان میں پیدا ہوں۔ تو بھی ہمیں مایوس نہ ہونا چاہئے۔ اگر کوشش کرینگے تو ہم بھی کچھ نہ کچھ کر رکھینگے۔ کیونکہ دلی دن بھر میں گلزار نہیں ہوگئی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مضامین جو اب تک اُن احاطوں کو آباد کر رہے ہیں۔ وہ خود اس قیامت کے مضمون ہیں جن میں شیطان ملعون نے اپنے سارے مزے کوٹ کوٹ کر بھر دئے ہیں۔ اگر کسی شاعر کی زبان میں قدرتی لذت کم ہو۔ تو بھی مضامین مذکورہ اپنی گرمی سے زنجک کی طرح شعر کو لے اُڑتے ہیں۔ البتہ عام مضامین میں ایسی چمک دمک پیدا کرنے کے لئے ایک قدرتی قوت زبان و بیان کی اور اصلی فصاحت

اعلےٰ درجہ کی چاہئے۔ تب ہر ایک مضمون کو ویسا ہی گرمائے جسے سُننے والے کا دل پھڑک کر لوٹ جائے۔ اگرچہ مدّت سے مجھے اور اکثر اہل وطن کو اس کا خیال ہے۔ مگر اب تقریر میں آنے کا باعث یہ ہے کہ دیکھتا ہوں آج کل ہماری گورنمنٹ اور اُن ارکین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے۔ جن کے دِل ہماری تعلیم کا ذمّہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کریگی ؛

میرے اہل وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے۔ ایک ہندو ایک مسلمان۔ تم جانتے ہو۔ کہ ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں۔ کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان کا اصلی جوہر ہے۔ اگر بھاشا ہے تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے۔ سنسکرت کی قوتِ نظم خود حدبیان سے باہر ہے۔ کیونکہ مضامین شاعرانہ درکنار۔ اُس نے تاریخ سے لے کر جغرافیہ طب منطق۔ فقہ تک جس علم کو لیا۔ نظم کی جنتری میں کھینچ لیا۔ دوسرا جز مسلمان جن کی اصل عرب۔ عربی وہ زبان ہے کہ جس میں مرد تو بالائے طاق گھروں کی عورتیں۔ بلکہ لونڈیاں جب اپنی جوش تقریر پر آتی تھیں تو اُن کا کلام ایک پُرزور نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں۔ کہ ایسے بزرگوں کی اولاد اپنے بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ آج ہماری زبان حرفِ تاثیر سے خالی ہو۔ کیا یہ رنج کی جگہ نہیں کہ اَوروں کے سامنے ہماری زبان ضعف بیانی کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو۔ اے خاک ہندوستان اگر تجھ میں امرالقیس اور لبید نہیں۔ تو کوئی کالیداس ہی نکال۔ اے ہندوستان کے صحرا و دشت فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کردو ؛

جاننے والے جانتے ہیں کہ شاعری کے لئے اوّل قدرتی جوہر بعد اُس کے چند تحصیلی اور علمی لیاقتیں چاہئیں۔ بعد اس کے شوق کامل اور مشق دوامی بِیْن شعر

گے میدان میں بھی سوار نہیں۔ پیادہ ہوں۔ اور نظم میں خاک افتادہ۔ مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آجکل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں۔ جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں۔ اور ایک مثنوی جو رات کی حالت پر لکھی ہے۔ اس وقت گزارش کرتا ہوں:۔

شام کی آمد اور رات کی کیفیت

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
ہیں روز و شب زمانے کے بیہم قدم ترے
کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے
ہوتا زمانہ بسکہ ہے وابستہ شام سے

عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے
اور ڈالی اُس پہ شام نے غربت کی گرد ہے
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامانِ کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو

اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں
جو کچھ کہ تھے سفید و سیہ آشکار تھے
دولاب چرخ پہ مگر اپنا مدار ہے
دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لئے

اور روشنی تھی عام زمین آسمان میں
جاری سب اپنی اپنی جگہ کاروبار تھے
چلتا اسی پہ دَورِ خزان و بہار ہے
اور رات کو بنایا ہے آرام کے لئے

رخصت ہو تو کہ آئی شبِ مشک ریز ہے
پھر صبح اُٹھ کے چلنا گریزا گریز ہے

آ اے شبِ سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
آمد کی تیری شان تو زیبِ رقم کروں

عالم میں شاہزادیِ مشکیں نسب ہے تو
پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں

ہونا وہ بعد شام شفق میں عیاں ترا
تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں
چمکیگا لشکر اب جو ترا آسمان پر

اُڑنا وہ آبنوس کا تخت رواں ترا
لہرانا پرنیان وحریر سیاہ میں
فرماں نشان میں یہ اُڑیگا جہان پر

تا صبح ہووے کارگہ روزگار بند
آرام حکم عام ہو اور کاروبار بند

اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے
لکھنا ہوں سب حساب پڑھا جاتا کچھ نہیں

ہر گوہر اُس میں ملک حبش کا خراج ہے
ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں

اس رنگ پر دکھارہی کیا آب وتاب ہے
تیرا چمکتا چہرۂ سیاہ آفتاب ہے

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی
دُنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں
بجلی ہنسے تو رُخ ترا دیتا بہار ہے

ہاتھوں سے مشک اُڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پہ آدھے جہان پر

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر
ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگ گیا ہے سوار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں

اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی
ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر
دامان دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
چوکا ہے بلکہ راہزن نابکار بھی
عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
سب آگئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے خواب عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر
کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے

بیٹھا تھا جس کا سکۂ زریں آسمان پر
رکھکر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
سکّہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے

محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اُس کا حکم تو سونا عمل ترا

مزدور جابجا۔ تھے جو دُکھ درد پا رہے
بارِ گراں غریبوں نے سر پر اُٹھائے ہیں

اور پاؤں تک سروں کے پسینے بہا رہے
جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں

اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پسار کے

دن بھر کے ہیں مسافر محنت زدہ بہت
آئے ہیں دن کی دھوپ میں منزل جو مار کر

آوارہ تابشام ہیں شامت زدہ بہت
رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اُتار کر

اے رات تو نے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے
اس وقت ان بچاروں نے آرام پایا ہے

اس دم امیرزادے کئی بے نظیر ہیں
دن کا تو رنگ ہو چکا اب رنگ اَور ہے
اک گلعذار سامنے سرگرم ناز ہے

مسند کے آسمان پہ بدرِ منیر ہیں
پردہ میں شب کے بادۂ گلگوں کا دَور ہے
اور جام دے رہی نگہِ نیم باز ہے

کھٹکے لگا کے کمرے میں اب بند ہوتے ہیں
اور وصل کے بچھونے میں، پیوند ہوتے ہیں

اکثر امیر لیٹے ہیں نعمت کے ناز میں
سامان عیش سب ہیں مہیا کئے ہوئے

پر دل کو اُن کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں
جو مانگئے زمانہ ہے حاضر لئے ہوئے

مخمل کا فرش ہے۔ مگر آرام ہی نہیں
جھپکے پلک۔ سو اس کا کہیں نام ہی نہیں

ان کے سوا بھی خلق میں انساں بہت سے ہیں
دن ہوئے یا ہو رات انہیں کام کچھ نہیں

آرام نے دئے ہوئے ساماں بہت سے ہیں
اور کام ہے تو یہ ہے کہ آرام کچھ نہیں

وہ بھی پڑے ترستے ہیں لطفِ حیات کو
کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹینگے رات کو

اور اُن کے زیر سایہ پڑا اک غریب ہے
تھا صبح دم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو
اب اپنی نانِ خشک کو پانی میں چور کر

دن بھر اُٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے
وہ حق حلال کر کے گھر آیا ہے شام کو
کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور پر

سر پر قیامت آئے تو اس کو خبر نہیں
سونا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں

یہ بھی نہ کہنا تم کہ جو آرام عام ہے
بندے خدا کے ایسے یہاں بیشمار ہیں
کیجے ذرا خیال کہ مُلّائے نکتہ داں
کرتا نظر ہے متن پہ بھی حاشیہ پہ بھی
ہر لفظ کو پہناتا ہے معنی نئے نئے
لیکن کبھی مقاصدِ اصلی سے چھوٹ کے

وہ سب دلوں کے واسطے غفلت کا جام ہے
دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں
بیٹھا ہے سر جھکائے بپائے چراغداں
مضموں جو ہمارگر ہیں اُلجھتے کبھی کبھی
دکھلاتا زور طبع ہے یعنی نئے نئے
کرتا ہے آپ ردّ و قدح جھوٹ موٹ کے

بیٹھا حرام کر کے ہے آرام و خواب کو
کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں ذور سے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے

کل صبح امتحاں ہے۔ سو اسکے خیال میں
پڑھتے جُدا جُدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد۔ یہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے۔ یہ محنت ضرور ہے

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں
آدھی بجی ہے پر وہ ابھی ہے دکان میں
گنتی میں دام دام کے ہے دم دئے ہوئے
بیٹھا ہے گود میں بہی کھانا لئے ہوئے

ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی
لیکن غضب ہے۔ بدھ نہیں ملتی چھدام کی

اور دیکھنا نجومیٔ دانا کی شان کو
ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسمان کو
اک آنکھ دوربین پہ ہے اک کتاب پر
ہے محو اپنے زائچہ میں اک حساب پر
کٹتی ہے اس کی تارے ہی گن کر تمام رات
پر اب تو لگ رہے یہی دن بھر تمام رات
پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں
نکلے نئے ستارے سر چرخ پیر ہیں

اک جنتری بناؤں کہ طرز جدید ہو
چمکے جو اس میں اپنا ستارہ نو عید ہو

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
دزد سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے
اور ہاتھ ڈالا اسکے ہر اک بن و آن میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر

لے جائیگا غرضکہ جو کچھ ہاتھ آئیگا
دیکھو۔ کمایا کس نے ہے اور کون اڑائیگا

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے
بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے
اڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اتار کر
جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پر افسوں نئے نئے
ہوجاتے ہیں وہی دُرِ مضموں نئے نئے

مضمونِ تازہ گر کوئی اس آن مل گیا

یوں خوش ہے جیسے نقش سلیمان مل گیا

اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے
مطلب اُڑاتا شعر سے مضمون غزل سے ہے
پھرتا ٹٹولتا ہوا مانندِ کور ہے
لاتا پرایے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے

تعریفیں اُسکی کرتے ہیں جو شعر سُنتے ہیں
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دُھنتے ہیں

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں
پھیلائے ہاتھ صورتِ اُمیدوار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
آزاد سر جُھکائے خدا کی جناب میں
اور کرتا صدق دل سے دُعا بار بار ہے
رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض

یا رب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں
کرجاتا صاف دشمن بد میں یہ چوٹ ہے
کرتا ہے اُس کو خرچ عدو کے علاج میں
اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

اے رات یہ جو تو نے سر شام آن کر
اور اُس پہ حق پرست کہ یادِ خدا میں ہے
اس کو اسی کی ذات سے ہے لو لگی ہوئی
سجادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر
بیٹھا رہِ فنا پہ ہوائے بقا میں ہے
اور دل میں دم بدم ہے تگ و دو لگی ہوئی

کب تک رہے حباب گلا گھوٹ گھوٹ کر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ پھوٹ کر

دریا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے
بیٹھے اسی کی آس پہ ہیں دل دئے ہوئے
بادِ مراد دینی ہوائے مراد ہے
اہل جہاز جن کا خدا کارساز ہے
کچھ حسرتیں ہیں دل میں کچھ ارماں لئے ہوئے
پر دل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے

آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں بادبان پر
اور جاتی ہے دعا کی صدا آسمان پر

یہ سب کے سب ہیں بیٹھے ہوا کی اُمید پر
اے ناخدا تو رہیو خدا کی اُمید پر

دل دے رہا جو شیر محبت کے جام ہے
ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے گھر کے تھک رہی
بچّہ کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
اور کہتی ہے کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے
ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اچھل پڑے

ماں کو تو سوتے جاگتے اسکا ہی دھیان ہے
کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے

پر جلے حیف حال اُسی جان بلب کا ہے
سب جس کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہے
لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
بتی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی
اور بیکسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
اے رات مجھ کو فکر بھی بار بار ہے
اس کی تو زندگی کوئی دم کا تما ہے

کون اس کا ساتھ دیویگا ہو صبح جب تلک
روئیگا کوئی شام کے مردے کو کب تلک

آزاد آفریں تری لطفِ زبان کو
پر کروٹ اب ہے رات نے دی آسمان کو
سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دئے ہوئے
تو کیوں ہے بیٹھا بادۂ غفلت پئے ہوئے

کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

اسد اللہ کاتب (آبیوں ضلع اوناؤ۔ اودھ)
لاہور۔ بازار سریوں والہ۔ (سنہ ۱۹۱۴ء)